جان کر منجملۂ خاصان میخانہ تجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ تجھے

ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

تذکرہ

خاتم المدرسین زبدۃ المحققین استاذ العلماء

حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی نور اللہ مرقدہٗ

مولانا مفتی **اختر امام عادل قاسمی**

بانی و مہتمم جامعہ ربانی منورواشریف

تفصیلات

نام کتاب : ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم (تذکرہ حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی)

مؤلف : **مولانا مفتی اختر امام عادل قاسمی**

صفحات : ٦٤

ناشر: **مفتی ظفیر الدین اکیڈمی، جامعہ ربانی منوروا شریف**

قیمت :

ملنے کے پتے

جامعہ ربانی منوروا شریف، پوسٹ سوہما، وایا بتھان، ضلع سمستی پور بہار

(**نوٹ**) جامعہ کے ویب سائٹ سے فری میں یہ کتاب ڈاؤن لوڈ کی جاسکتی ہے، اور آن لائن پڑھی جاسکتی ہے۔

فہرست آخر میں ملاحظہ فرمائیں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

''زندگی بلبلہ ہے پانی کا''......قطرہ کی اٹھان کا نام زندگی اور اس کی اتار کا نام موت ہے......بلبل کی چہک، کوئل کی لہک، شعلہ کی لپک رواں دواں زندگی کی علامت ہے اور ان کی خاموشی موت کے ہم معنیٰ......عروج اور زوال اس دنیا کی ناقابل انکار حقیقت ہے، زندگی کی طرف سفر کرنے کا نام عروج اور موت کی طرف قدم بڑھانے کا نام زوال ہے،......کسی شئے کا وجود خود اس کے عدم کی دلیل ہے،...... ہر بلندی کے پیچھے ایک پستی چھپی ہوتی ہے، انسان کی پوری زندگی اسی بلندی و پستی کو عبور کرنے میں گذر جاتی ہے،...... جب انسان کچھ نہیں تھا تو وجود میں آجاتا ہے، اور شہود میں آتے ہی عدم کا سفر شروع ہو جاتا ہے،......

جب قابل ذکر نہیں تھا تو اس کو ایک نام اور ایک سلیقہ دیا گیا اور جب اسی سلیقہ اور ہدایت الٰہی کی روشنی میں وہ شہرت کی بلندیوں پر پہونچا اور ہر طرف اس کے ذکر کے غلغلے بلند ہوئے تو اسے خاموش سناٹے میں پہونچا دیا گیا جہاں سے کسی کی واپسی ہوئی ہے نہ ہوگی،......

لافانی زندگی

یہ ایک سچی حقیقت ہے کہ دنیا کی ہر چیز کی طرح انسانی زندگی بھی فانی ہے،......لیکن اس سے بڑی سچی حقیقت یہ ہے کہ خود انسان اپنی ذات میں لافانی ہے، بقول خمارؔ بارہ بنکوی:

؎ یہ مانا زندگی فانی ہے لیکن
اگر آجائے جینا جاوداں ہے

یہ جینا جسے آجائے وہ کبھی نہیں مرتا، اس کی ہستی اس کے جسد خاکی کی اسیر نہیں ہوتی، اس کا وجود زندگی کے نشیب و فراز کا پابند نہیں ہوتا، یہ دنیائے آب و گل اس کی شخصیت کے لئے زنجیر نہیں بنتی، زندگی اور موت اس کے عروج و زوال کی علامت نہیں بلکہ یہ دونوں حیات مستعار ہی کے الگ الگ عنوان ہوتے ہیں، زندگی بھی زندگی ہے اور موت

بھی اس کے لئے حیات جاوداں کی نوید ہوتی ہے، نہ اس کی زندگی میں اسے مٹایا جاسکتا ہے اور نہ اس کے مرنے کے بعد اس کو بھلایا جاسکتا ہے،...... جب تک انسان فرش گیتی پر رہتا ہے صرف زندہ رہتا ہے، لیکن جب وہ روح ناسوت تک پہونچ جاتا ہے اور انسانی دلوں کے عرش الٰہی پر بسیرا کر لیتا ہے تو وہ زندۂ جاوید بن جاتا ہے، اس کا جسم قبر کی آغوش میں اور اس کا وجود لوگوں کے قلوب میں محفوظ ہو جاتا ہے،...... دل گوشت پوست کے لوتھڑے کا نام نہیں بلکہ یہ عرش الٰہی ہے، دل کی دنیا بڑی البیلی، بڑی ناپیدا کنار ہے، صدیوں بلکہ ہزاروں سال تک انسان وہاں زندہ رہتا ہے، اسے زندہ رہنے کے لئے نہ کسی نشیمن کی ضرورت ہے اور نہ پرواز کے لئے بال و پر کی، وہ بلندیوں اور وسعتوں میں اقبالؔ کے شاہین سے بھی ماورا ہو جاتا ہے،

؎ نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد پہ
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

یہ چیزیں لکھنے میں جتنی آسان ہیں، برتنے میں اتنی آسان نہیں ہیں، صدیوں میں دو چار خوش نصیب ہوتے ہیں جو ایسی زندگی پاتے ہیں، بقول شاعر:

؎ ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مدت میں ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

زندۂ جاوید

ہم نے اپنی چھوٹی سی زندگی میں جن چند ممتاز ہستیوں کو زندگی کی اس تعریف کا مصداق پایا ان میں میرے استاذ مکرم، مربی کبیر حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ سر فہرست ہیں، جو ساری زندگی قید مقام سے بالاتر رہے، ہمیشہ دلوں کے مکین رہے، جاننے والوں نے ہمیشہ ان کو ان کی نسبت ذات سے جانا، تعارف کے لئے کسی مقام کی نسبت ان کے لئے محض عارضی رہی، جہاں رہے پوری آب وتاب کے ساتھ رہے، اصولوں سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا، اقامت وسفر، مکان ومقام، تنہا یا جماعت اور فراوانی وبے سروسامانی ان کی زندگی میں بے معنیٰ الفاظ تھے،...... وہ ہمیشہ اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہے، ان کا لمحہ لمحہ مضطرب اور گھڑی گھڑی بے چین گذری، وہ اقامت میں بھی سراپا سفر اور سفر میں بھی میں یکگونہ مقیم رہتے تھے،...... جہاں رہے اپنے کارواں کے ساتھ رہے،...... پروانوں کو شمع کی ایسی تلاش رہتی کہ

جہاں گئے وہیں کارواں بن گیا، ......ایسا منبع فیض استاذ کم دیکھا گیا، جہاں جہاں گذر گئے روشنی پہونچ گئی ، جہاں جہاں ٹھہر گئے درسگاہ بن گئی، ......علم کا نمود ونفوذ جیسا ان کی شخصیت میں دیکھا کہ شاید آج کسی اور کو ان کی مثال کہہ سکیں، ......

مولانا کا اصل امتیاز

مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے عہد کے سب سے بلند ترین آدمی تھے، ......نہیں، مختلف علوم وفنون اور نوع بنوع کمالات میں ان سے بھی قد آور لوگ موجود ہیں، خود ان کے اساتذہ ومشائخ تھے، علاوہ بہت سی صاحب کمال اور یگانۂ روزگار شخصیتیں موجود تھیں اور ہیں، ......مگر جو بات ان کو اپنے ہم عصروں سے ممتاز کرتی ہے وہ ان کا انداز تربیت ، اہل طلب سے حسن تعلق، درس وتدریس اور علم وفن کی توسیع واشاعت کے لئے حد درجہ فنائیت اور اکابر کے روایتی نظام تعلیم وتربیت پر اس قدر یقین کہ اس میں کسی لچک کی گنجائش نہیں تھی ......وہ جس چیز پر یقین کرتے تھے اس کو منوانا بھی جانتے تھے، اور اس میں ان کی ذہانت وذکاوت اور علمی حاضر دماغی سے زیادہ ان کی جاذبیت اور بے پناہ اپنائیت کا دخل ہوتا تھا، ......آج جبکہ زیادہ تر لوگ ابلاغ وترسیل سے زیادہ اپنی ذمہ داری محسوس نہیں کرتے، مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ کا کمال یہ تھا کہ وہ اپنی کوششوں کے نتائج کے لئے بھی بے چین رہتے تھے، ......اور اسی لحاظ سے وہ کبھی مظہر جلال نظر آتے تھے تو کبھی پیکر جمال، قلب میں گداز اور روح میں سوز ایسا جو کبھی اثر سے خالی نہیں جاتا تھا، ......ان چیزوں نے ان کی شخصیت کو مقناطیسی بنا دیا تھا، جہاں گئے طلبہ کا قافلہ ہمراہ گیا، پوری زندگی مشتاقان علم کے ہجوم میں گذری محفل تو محفل گوشۂ عافیت میں بھی فرصت نہیں ملی اور وہ اس کے ایسے لذت آشنا کہ مجال تھی کہ چہرہ پر ناگواری کی شکن بھی آجائے ......اللہ ان کو غریق رحمت فرمائے آمین،

پھونک کر اپنے آشیانہ کو

خودغرضی ومادیت کے اس دور میں تدریس فن اور تربیت ذات کے لئے زندگی کا ایک ایک لمحہ لگا دینے والا اور اپنے لئے کچھ نہ بچا رکھنے والا استاذ کمیاب نہیں، نایاب ہے، اس معاملہ میں ان کی شخصیت خود اپنی جگہ اعجاز تھی ......

پھونک کر اپنے آشیانہ کو
بخش دی روشنی زمانہ کو

حالانکہ ایسا نہیں تھا کہ وہ اپنے لئے کچھ کرنے کی قدرت نہ رکھتے تھے، ......ان کے دم سے کتنے ہی اداروں کا وقار قائم تھا، ان کی آمد سے بڑے بڑے مدرسوں اور جامعات کی عظمتوں میں چار چاند لگ جاتے تھے، ان کی برکت قدم سے معمولی مکاتب علم وفن کی بڑی درسگاہوں میں تبدیل ہو جاتی تھیں، ......ان کے پاس نہ افراد کی کمی تھی اور نہ وسائل کی، وہ چاہتے تو خود اپنا ایک بڑا دار العلوم بنا سکتے تھے، ......لیکن اس فقر اختیاری کو کیا کہئے کہ ساری زندگی اپنا ذاتی آشیانہ بھی نہ بنا سکے کہ شاہین کسی بسیرے کا پابند نہیں ہوتا، ان کی نگاہ ہمیشہ اپنے پروردگار کی مرضی پر ٹکی رہی ، ......خود مولانا کے الفاظ میں:

> ’’اللہ نے مجھے اولاد کی نعمت سے نوازا مگر میرے پاس رہائش کے لئے کوئی مکان کبھی نہیں رہا، جس مدرسہ میں پڑھایا وہاں کے لوگوں نے میری رہائش کا انتظام کیا، اپنے گاؤں میں تعطیلات میں آیا تو کسی رشتہ دار کے خالی مکان میں رہ لیا، کچھ وقت والد کے مکان میں گذار لیا، اس کی وجہ سے کبھی کبھی تنگی پیش آتی تھی مگر میری لاابالی طبیعت اسے نظر انداز کر دیتی تھی......
>
> (سہ ماہی سراج الاسلام چھپرہ ضلع مئو یوپی شمارہ محرم تا ربیع الاول ۱۴۳۵ھ ص ۲۷)

اخیر میں اپنے بچوں کے لئے تھوڑی سی فکر پیدا ہوئی تھی، اپنے مجموعۂ مکاتیب ’’حدیث دوستاں‘‘ میں لکھتے ہیں:

> ’’پچھلے کسی خط میں میں نے عرض کیا تھا کہ اب وہ دن قریب ہے کہ میرے بچوں کو اپنا اپنا گھر آباد کرنا ہوگا لیکن گھر تو ہے نہیں اور نہ گھر کا کوئی انتظام ہے، غیب میں سب کچھ ہے، اس کے شہود میں آجانے کی دعا فرما دیجئے (ص ۶۰)

حیات مستعار کو الوداع کہنے سے تھوڑے دنوں قبل اپنے بچوں کے لئے وادیٔ غربت میں ایک اجڑے ہوئے تالاب کے کنارے ایک مکان کی شروعات کی مگر اس کی تکمیل وتزئین سے قبل ہی شہر خموشاں کے مکین ہو گئے اور اپنے مکان ناتمام کے بازو میں اپنی آخری منزل بنائی انا للہ وانا الیہ راجعون ......جانب مشرق مدرسہ کی مسجد ہے، مسجد سے شرق میں اس مدرسہ کی ناپختہ عمارات ہیں جس کو حضرت مولاناؒ کی آخری آرامگاہ بننے کا شرف حاصل ہوا، ......مکان سے متصل مسجد کے جنوب میں وہ خالی زمین ہے جہاں مولانا روحانیت کی درسگاہ (خانقاہ) کھولنا

چاہتے تھے...... لیکن عمر نے وفا نہ کی اور ان کو اس کا موقعہ نہ مل سکا، کاش اگر ایسا ہو جاتا تو مولانا کا جو سوز جگر اور انداز تربیت تھا دنیا دیکھ لیتی کہ اس میدان میں بھی کیسے کیسے لعل و گہر نکلتے، ...... آج اس ویرانے میں مولانا مرحوم کا مرقد روحانیت کا مسکن اور محبت و سکینت کا مینار معلوم ہوتا ہے، فرحمہٗ اللہ

آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

میرے تعلق کی ابتدا

مولانا سے میرا تعلق بہت قدیم ہے، میں مولانا کے اس دور کے شاگردوں میں ہوں جب ان پر گوشہ نشینی اور خلوت پسندی کا غلبہ تھا، لوگوں سے بہت زیادہ ملنا جلنا ان کو پسند نہیں تھا، نہ کہیں آنا نہ جانا، نہ کسی جلسہ و دینی تقریب میں شرکت، کسی شدید ضرورت ہی کے لئے باہر جانا ہوتا تھا، جیسے کوئی شکستہ دل حکمراں ساری دنیا سے بیزار ہو کر کسی ویران مقبرہ کے کھنڈر میں پناہ گزیں ہو جائے، ...... اتفاق سے ان کو جگہ بھی حضرت شاہ وصی اللہ فتحپوری ثم الہ آبادیؒ کی حویلی کے اس حصہ میں ملی تھی جہاں خانقاہ کے نام پر ایک کھپڑا پوش خام عمارت تھی، اس کے بازو میں چھوٹے چھوٹے چند کمرے تھے، انہی میں سے ایک کمرہ مولانا کو ملا ہوا تھا، دوسری طرف ایک حصہ میں مولانا کے اہل و عیال رہتے تھے، ...... وہیں ایک طرف مدرسہ کا مطبخ تھا، جہاں دوپہر کو اور شام میں طلبہ کھانا لینے کے لئے آتے تھے اور تھوڑی دیر کے لئے چہل پہل ہو جاتی تھی، پھر وہی سناٹا......

ابتدا میں مجھے مدرسہ والی مسجد (جس کو ڈھال والی مسجد کہتے تھے) کے ایک کمرہ میں جگہ ملی تھی، بعد میں اسی کھپڑا پوش خانقاہ میں ٹھکانہ ملا اور چونکہ فرش کچا تھا اس لئے چارپائی خریدنی پڑی، میرے ساتھ میرا بھائی رضوان احمد بھی تھا اس لئے دو چارپائیاں خریدی گئیں، میری عمر اس وقت بمشکل دس سال کی ہوگی، ...... لیکن مجھے خوب یاد ہے کہ یہ ساری کاروائی ہمارے مولانا ہی نے انجام دی تھی، ...... اس واقعہ کو چونتیس (۳۴) سال کا عرصہ بیت گیا، بچے جوان اور جوان بوڑھے ہو گئے، مگر آئینۂ خیال پر یہ اس قدر تازہ ہے جیسے آج بھی میں اسی عہد طفولیت میں ہوں اور مولانا کی شفقت اسی طرح سایہ فگن ہو، کاش کہ ایسا ہی ہوتا......

ع لوٹ ماضی کی طرف اے گردش ایام تو

مدرسہ وصیۃ العلوم الٰہ آباد- کچھ یادیں

غالباً ۱۹۷۹ء کی بات ہے، جب میں حصول علم کے لئے مدرسہ وصیۃ العلوم الٰہ آباد میں داخل ہوا، میرے پھوپھی زاد بھائی مولانا محمد شعیب قاسمی وہاں کے قدیم طلبہ میں تھے، اس سے قبل حکیم محمد یعقوب صاحب وہاں سے پڑھنے بعد وہیں کسی ملازمت سے وابستہ ہوگئے تھے، یہی دونوں حضرات میرے وہاں پہونچنے کا ذریعہ بنے ،......حضرت شاہ وصی اللہ صاحبؒ کے انتقال پر دس سال سے زیادہ کا عرصہ بیت چکا تھا، مگر لوگوں کے دل ودماغ پر اس طرح چھائے ہوئے تھے جیسے کہ ابھی بھی موجود ہوں، حضرت کی خدمات وتعلیمات کے زندہ نقوش وہاں ہر طرف پھیلے ہوئے تھے، ان کا قائم کردہ ادارہ مدرسہ وصیۃ العلوم پورے شان وشکوہ کے ساتھ چل رہا تھا اور پورے خطۂ مشرق میں اس کو مرکزی حیثیت حاصل تھی، طلبہ کا رجوع بھی تھا، اور لوگوں کی آمد ورفت بھی بہت تھی......آپ کے خلفاء، مریدین اور تیار کردہ افراد کی بڑی جماعت موجود تھی،...... ہر طرف آب وہوا میں روحانیت کی خوشبو رچی بسی تھی، حضرت کے بڑے داماد اور جانشین حضرت مولانا قاری محمد مبین صاحب دامت برکاتہم خانقاہ کے سجادہ نشیں تھے، ان کے دم سے خانقاہ آباد تھی، ان کی مجلس میں قریب وبعید کے سالکین ومنتسبین بڑی تعداد میں شرکت کرتے تھے......

الٰہ آباد پہلے بھی علم ودانش کی سرزمین رہی ہے، وہاں کا مدرسہ سبحانیہ ہندوستان کے مردم خیز اور افراد ساز اداروں میں شمار ہوتا ہے، جہاں سے مفکر اسلام، فقیہ النفس حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ بانی امارت شرعیہ بہار اور ممتاز فقیہ ومصنف حضرت مولانا عبدالصمد رحمانیؒ نائب امیر شریعت بہار واڑیسہ جیسی یگانۂ روزگار شخصیتیں پیدا ہوئیں ،......مگر اب وہ تاریخ کا حصہ بن چکا ہے،......حضرت قاری محمد حبیب صاحبؒ کا مدرسۂ حفظ وقرأت (کٹرہ) ابھی اپنی آن وبان باقی رکھے ہوئے تھا، قاری صاحبؒ اس وقت حیات سے تھے اور ان کی خدمات کو بڑے ہی قدر واحترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

کچھ عرصہ قبل حضرت شاہ صاحب کی خانقاہ سے قریب ہی مدرسہ بیت المعارف قائم ہو چکا تھا، جو ابھی ابتدائی دور سے گذر رہا تھا، یہ مدرسہ حضرت شاہ صاحبؒ کے دوسرے داماد حضرت مولانا قمر الزماں صاحب الٰہ آبادی کی فکر وکاوش کا نتیجہ تھا، حضرت شاہ صاحبؒ کی حیات میں سارے لوگ ایک نقطہ پر سمٹے ہوئے تھے، آپ کے انتقال کے بعد سب بکھر کر بحر بے کراں بن گئے، مولانا عمار احمد صاحب الٰہ آبادی بھی اسی کہکشاں کا حصہ تھے، جو ٹوٹ کر پہلے

بیت المعارف کی زینت بنے، پھرانہوں نے افضل المعارف کے نام سے خوداپنی ایک عظیم الشان انجمن سجائی ،......آج تواور بھی بہت سے چھوٹے بڑے مدرسے قائم ہوگئے ہیں لیکن میری طالبعلمی کے دور میں قابل ذکر مدرسہ صرف وصیۃ العلوم تھا،......

مدرسہ وصیۃ العلوم کی شان

اس کے معیار تعلیم کا اندازہ اس سے لگایئے کہ میں درجہ فارسی کا طالب علم تھا،ہم تقریباً پانچ ساتھی تھے،ان میں ایک ذہین ترین ساتھی مولوی عبدالعزیز تھے،ہم دونوں بے تکلف آپس میں فارسی میں باتیں کیا کرتے تھے،ہم لوگوں نے مہینوں آپس میں اردو میں بات چیت نہیں کی اور ہم اتنی رواں فارسی بولتے تھے کہ لوگوں کو رٹے ہوئے ہونے کا گمان ہوتا تھا،حالانکہ ایسی بات نہیں تھی،ہم لوگ بلاسوچے سمجھے روزمرہ کی ضروریات سے لیکر مختلف موضوعات پر بے ساختہ فارسی میں گفتگو کرسکتے تھے،یہ تو فارسی کی استعداد کا معاملہ تھا،......کتابوں پر محنت ایسی ہوتی تھی کہ حفظ کی جانی والی تمام کتابیں اتنی ازبریاد ہوجاتی تھیں کہ نماز کی طرح صف بستہ ہوکر تمام ساتھی ان کی بالاستیعاب تلاوت کرسکتے تھےاور بھولنے پر ہر ساتھی لقمہ دینے کی صلاحیت رکھتا تھا،......اسی طرح فارسی اور عربی قواعد کو ذہن نشیں کرایا جاتا تھا،......اورلغات والفاظ زیادہ سے زیادہ ذہن میں محفوظ کرائے جاتے تھے،اس معاملہ میں حضرت مولانا محمد عرفان صاحب دامت برکاتہم ناظم تعلیمات کوخاص ملکہ حاصل تھا۔

میں سمجھتا ہوں کہ ان خصوصیات کا حامل ادارہ نہ اس زمانہ میں وہاں کوئی تھا،اور نہ آج وہاں کسی ادارہ کے بارے میں خوش امیدی کا امکان ہے،

دیوبندی بریلوی کشمکش

☆ بریلویوں کا مدرسہ غریب نواز بھی کافی مشہور تھااور مشتاق احمد نظامی صاحب کی وہاں بہت دھوم تھی ،بریلویوں کے بڑے بڑے جلسے مدرسہ وصیۃ العلوم والی مسجد کے سامنے ہوتے اور کیا مجال کہ کوئی اسے بھنگ کردیتا ،اس میں وہ حضرات اپنی عادت کے مطابق علماء دیوبند کا تمسخر بھی اڑایا کرتے تھے،ایک دو جلسے میں نے بھی اپنے زمانہ میں سنے،......دونوں مدرسوں میں زیادہ فاصلہ نہیں تھا،اس لئے طلبہ میں بھی آپس میں مڈبھیڑ ہوا کرتی تھی اور مارپیٹ تک کی نوبت آجاتی تھی،......کبھی الہ آباد کے مشہور باغ خسرو باغ میں اس طرح کے مقابلے ہوتے تھے،

میرے گھر کا خانقاہی مزاج

میں خالص خانقاہی ماحول سے وہاں گیا تھا، ہمارے یہاں اس طرح کی مسلکی منافرت کا کوئی چرچا نہیں تھا، اکثر ایک ہی فکر و عقیدہ کے لوگ تھے، میرے پڑدادا حضرت مولانا عبدالشکور آہ مظفر پوریؒ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے تلمیذ خاص اور دارالعلوم دیوبند کے نامور فرزند تھے، اس سے قبل وہ حضرت مولانا احمد حسن کانپوریؒ خلیفۂ اجل حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ کی شاگردی میں رہ چکے تھے اور کانپور میں لمبے عرصے تک ان سے استفادہ کیا تھا، ...... میرے جدامجد قطب الہند حضرت مولانا الحاج حکیم احمد حسن منورویؒ شمالی و مشرقی بہار اور مغربی بنگال میں سلسلۂ نقشبندیہ کے ممتاز مشائخ میں تھے، ان کے منتسبین و مریدین میں دونوں طرح کے لوگ تھے، ان میں سے بہت سے لوگ جدامجد کے گذرنے کے بعد بھی منورواآتے رہے، ان میں علماء بھی تھے، جدامجد کے منتسبین میں ایک طرف دیناجپور بنگال کے مولانا فقیر محمد صاحبؒ فاضل بریلی (ان کا شمار جدامجد کے خلفاء میں ہوتا ہے) جیسے لوگ تھے تو وہیں دوسری جانب پورنیہ بہار کے جناب مولانا عبدالحمید قاسمی صاحب فاضل دیوبند تلمیذ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ وغیرہ بھی حلقۂ ارادت میں شامل تھے اور اکثر ایک مجلس اور ایک دسترخوان پر یہ لوگ جمع ہوتے اور سب پر ایک ہی رنگ چھایا ہوتا، اللہ کا رنگ، روحانیت کا رنگ...... مشرقی بہار اور بنگال کا علاقہ مسلکی منافرت کے معاملے میں کافی گرم مانا جاتا ہے، ادھر کے بعض حضرات اس حسین سنگم کو دیکھتے تو از راہ تلطف پوچھ بیٹھتے کہ آپ حضرات کا مسلک کیا ہے؟...... تو مسکرا کر جواب دیا جاتا، نقشبندیت، ......

اس باب میں اتنا خوبصورت، محبت آمیز اور اعتدال پسند ماحول میں نے اپنے گھر کے علاوہ کہیں نہیں دیکھا اور یہ سب میرے جدامجدؒ کی اخلاقی و روحانی تربیت کے اثرات تھے، ...... یہ روایت ہمارے گھر اور حلقے میں بہت دنوں تک باقی رہی، میرے والد ماجد حضرت مولانا سید محفوظ الرحمٰن صاحب نقشبندی دامت برکاتہم بھی اسی فکر و مزاج اور نقطۂ اعتدال کے حامل ہیں، اصلاً دیوبندی الفکر ہونے کے باوجود دونوں ہی مکاتب فکر کے بزرگوں کا وہ احترام کرتے ہیں، انہوں نے اس طریق کار سے بہت سی بدعتوں کا خاتمہ کیا، شدت پسند گھرانوں کے بچوں کو دیوبندی مدارس میں بھیجا، ...... یہ سلسلۂ زریں اس وقت تک قائم رہا جب تک کہ خود ان تبدیل شدہ گھرانوں کے نئے فضلاء نے شدت آمیز رویہ اختیار نہیں کرلیا، ...... آج اس حکمت عملی کے فوائد محسوس ہوتے ہیں جبکہ اس کے مواقع ہماری نادانیوں

کی وجہ سے جاتے رہے، ......

مشرب صوفیاء

صوفیاء کبھی شدت و تنگ نظری کو جگہ نہیں دیتے، وہ ہمیشہ ایسے طرز عمل سے بچتے ہیں جو خلق خدا میں نفرت وکشیدگی کا باعث ہو، اور جس سے عمل کے بجائے ردعمل کا جذبہ بیدار ہو، ان کے یہاں اصل مطلوب حق تک رسائی ہے اوراس کے لئے راستے مختلف ہو سکتے ہیں، ...... ہر انسان کے احوال وظروف جداگانہ ہوتے ہیں جن کے فرق سے راستے بدلتے ہیں، یہ مجتہدین صوفیاء طے کرتے ہیں کہ منزل تک پہونچنے کے لئے کس مسافر کو کون سا راستہ اختیار کرنا چاہئے؟ ...... کبھی مسافر اپنے راستے کے انتخاب میں غلطی کر سکتا ہے، لیکن صوفیا اسے مطعون کرنے بجائے اسے معذور رکھتے ہیں، ان کی نگاہ اس کے جذبہ وارادہ کے تقدس ومعصومیت پر ہوتی ہے، ...... ان کے اس طرز عمل سے بہتوں کو ہدایت مل جاتی ہے، اس لئے کہ دنیا کے اکثر لوگ محبت کے اسیر ہیں، نفرت وانتقام ایک وقتی اشتعال ہے، جو کسی ردعمل کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے اور پھر وقت کے گذرنے کے ساتھ بیٹھ جاتا ہے،

صوفیا کی نظر مشاہدات کے تنوع پر نہیں بلکہ مشہود کی وحدت پر ہوتی ہے، وہ ہر چیز میں مشاہدۂ ذات کرتے ہیں اس لئے ہر فکر ونظر کے انسان ان کو ایک ہی منزل کے مسافر محسوس ہوتے ہیں، راستے کے فرق سے منزل میں فرق نہیں پڑتا، وہ طریق کے اختلاف کو اختلاف منزل پر نہیں بلکہ اختلاف احوال پر محمول کرتے ہیں، احوال کا فرق مٹ جائے تو راستے کا فرق بھی مٹ جائے گا۔

ایک چرواہے کا قصہ

مولانا جلال الدین رومی صوفیانہ افکار وخیالات اور حقائق تصوف کے سب سے مستند ترجمان مانے جاتے ہیں، انہوں نے مثنوی معنوی میں ایک کمبل پوش چرواہے کا قصہ نقل کیا ہے، جو اپنے رب سے ہمکلام تھا...... حضرت موسیٰؑ نے پہاڑ سے اترتے ہوئے اس فقیر کو منہ نیچے کر کے بڑبڑاتے ہوئے دیکھا تو قریب جا کر سننے لگے، اس نے اپنے علم وعقل کے مطابق اللہ پاک سے اظہار محبت کے لئے جو پیرایۂ بیان اختیار کیا تھا وہ شریعت کے ظاہری قانون سے ہم آہنگ نہیں تھا، حضرت موسیٰؑ نے اسے ٹوکا تو وہ خوف سے کانپنے لگا، ایک ضرب لگائی اور اپنی بھیڑوں کو پیچھے چھوڑتا ہوا جنگل کی طرف نکل گیا، ...... نظر سے اوجھل ہونے کے بعد آسمان سے آواز آئی کہ اے موسیٰؑ! یہ آپ نے کیا

کیا؟ آپ نے میرے ایک چاہنے والے بندے کو مجھ سے الگ کر دیا، آپ کو ہم نے دنیا میں توڑنے کے لئے نہیں جوڑنے کے لئے، بھگانے کے لئے نہیں ملانے کے لئے بھیجا ہے:

؎ تو برائے وصل کردن آمدی
نہ برائے فصل کردن آمدی

ہم نے حق تک پہونچنے کے لئے ہر ایک کو اس کے ظرف کے مطابق الگ الگ راستے دیئے ہیں:

؎ ہندیاں را اصطلاحے دادہ اند
سندھیاں را اصطلاحے دیگرند

اے موسی! اہل دانش کے آداب اور ہیں، اور سوز عشق میں جلے بھنے لوگوں کا طریق اور......:

؎ موسیا! آداب داناں دیگرند
عاشقاں سوز دروناں دیگرند

موسیٰ! مذہب عشق کے انداز نرالے ہیں، لیکن اصل مقصود اتصال حق اور خدارسیدگی ہے،

؎ مذہب عشق از ہمہ ملت جداست
عاشقاں را مذہب وملت خداست

ہاتف غیبی کی آواز پر حضرت موسیٰؑ کو تنبہ ہوا، وہ اللہ سے معافی کے خواستگار ہوئے، آسمان سے آواز آئی جا میرے بندہ کو تلاش کر اور اسے خوشخبری سنا کہ تیری ساری ادائیں اللہ کو پسند ہیں اور تیری ساری خطائیں اللہ کی طرف سے معاف ہیں، حضرت موسیٰ اس کی تلاش میں نکلے، برسوں کے بعد وہ کہیں جنگل میں اکیلا کھڑا ہوا دکھائی دیا، حضرت موسیٰ نے اس کو خوش خبری سنائی، مگر اب تک وہ ہزاروں سال کا فاصلہ طے کر کے آگے جا چکا تھا اور خود کو مٹا کر خون دل میں لتھڑا پڑا تھا:

؎ من ہزاراں سال زاں سوگشتہ ام
من کنو در خون دل آ گشتہ ام

معصوم بچپن کی دعا

بہر حال میں جس ماحول کا پروردہ تھا اس کے لحاظ سے مجھے الہ آباد میں بڑی اجنبیت محسوس ہوئی، میری عمر بہت چھوٹی تھی، میرا شیشۂ ذہن بہت کچا تھا، میں پریشان ہوا کہ ایک دسترخوان اور ایک مصلیٰ پر اٹھنے بیٹھنے والے لوگ یہاں باہم دست وگریبان کیوں ہیں؟......خدا شاہد ہے مجھے طلبہ کی اس جنگ میں کبھی دلچسپی نہیں رہی، البتہ معصوم دل کے اضطراب نے اللہ پاک سے یہ فریاد ضرور کی کہ پروردگار! جس طریق سے تو راضی ہے، وہ راہ حق مجھ پہ منکشف فرمادے،......اور مجھے یقین ہے کہ معصوم لمحوں کی میری چند دعائیں جو اللہ پاک کے یہاں قبول ہوئیں ان میں ایک یہ بھی ہے،...... بعد میں جو حالات پیدا ہوئے، اور میرا رجحان جس تصلب کے ساتھ علوم قاسمیہ اور افکار دیو بند کی طرف منتقل ہوا اس میں اس قبولیت کے صاف آثار محسوس ہوتے ہیں۔

قافلہ سوئے دیوبند

☆ میرے قیام الہ آباد کے زمانہ ہی میں دار العلوم دیو بند کا صد سالہ اجلاس ہوا، قافلوں کے قافلے ادھر سے گذر رہے تھے، اجلاس کے لئے مستقل ٹرینیں چلائی گئی تھیں، ایک قافلہ الہ باد سے بھی گیا تھا، اس کے قائد حضرت مولانا قاری محمد مبین صاحب دامت برکاتہم تھے، اس موقعہ پر مدرسہ وصیۃ العلوم کے ایک مؤقر استاذ حضرت مولانا نعمان الدین صاحب معروفیؒ نے ایک تہنیتی نظم کہی تھی، اس کا ایک شعر آج بھی مجھے یاد ہے،

قافلہ جارہا ہے سوئے دیوبند
میر اس کے ہیں قاری مبیں دیکھئے

لکڑی کی کھڑاؤں

☆ الہ آباد میں میرا قیام قریب دوسال رہا، پہلے سال میری کوئی کتاب مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ صاحب کے پاس نہیں تھی، میں فارسی جماعت کا طالب علم تھا اور وہ اونچی جماعتوں کو پڑھاتے تھے، البتہ ان کے علم وذہانت اور قوت حافظہ کی شہرت سے دل بہت مرعوب تھا، ان کی قربت سے خوف محسوس ہوتا تھا، پھر وہ خانقاہ میں رہتے تھے اور میں مدرسہ کی مسجد کا حجرہ نشیں، یہاں حضرت مولانا نعمان الدین اعظمیؒ ہمارے نگراں وسرپرست تھے، اس لئے کہ

دارالاقامہ میں وہی رہتے تھے، ......ان کا کمرہ مسجد سے متصل بالائی حصہ پر تھا، وہ نیچے اوپر آنے جانے کے لئے لکڑی کی کھڑاؤں کا استعمال کرتے تھے، ......ان کے کھڑاؤں کی آواز عالم خیال میں آج بھی میری سماعت کے لئے فرحت بخش ہے، ......ان کو نہ چھڑی کی ضرورت تھی اور نہ کسی آلۂ تنبیہ کی، ان کی کھڑاؤں کی آواز ہی مضراب کا کام کرتی تھی ، یہی آواز صبح کو بیداری کا الارم بن جاتی اور اسی ساز پر پانچوں وقتوں کے نمازی مسجد کے لئے بھی دوڑ پڑتے تھے، ......کسی کھڑاؤں کا اتنا بہتر استعمال میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا، ......

کہکشاؤں کی ایک انجمن

میرے اساتذہ میں اس وقت مولانا نعمان صاحب کے علاوہ حضرت مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ، حضرت مولانا نورالہدیٰؒ (داماد حضرت شاہ وصی اللہؒ صاحب)، حضرت مولانا انواراحمد صاحب، حضرت مولانا قاری ارشاد احمد صاحب، حضرت مولانا عرفان احمد صاحب (داماد حضرت قاری مبین احمد صاحب) تھے، یہ سب حضرات اپنی اپنی جگہ علم وفن کے آفتاب و ماہتاب اور زہد وتقویٰ میں باکمال تھے، ......

آج مدارس میں جو قحط الرجال ہے اس کے تناظر میں دیکھتا ہوں تو جیسے یہ کہکشاؤں کی انجمن تھی جو وقت کے گذرنے کے ساتھ بکھر گئی۔

اساتذہ کی محبت وعقیدت

اس وقت طلبہ میں اساتذہ کا جو احترام پایا جاتا تھا وہ آج افسانہ معلوم ہوتا ہے، ہم لوگ اپنے اساتذہ کی جوتیاں سیدھی کرنے میں جو شرف محسوس کرتے تھے وہ شاید قارون کا خزانہ ملنے پر بھی محسوس نہ ہوتا، ...... مجھے خوب یاد ہے صبح کی نماز میں ایک بار مجھے حضرت قاری مبین صاحب کی جوتیاں اٹھانے کا موقعہ مل گیا اور قاری صاحب نے از راہ شفقت میرے سر پر ہاتھ رکھے اور شاید چار آنہ پیسے بھی عنایت فرمائے، ......اس کی لذت وفرحت کا احساس ہفتوں تک مجھے رہا، اس کے بعد پھر کبھی اس کا موقعہ نہ مل سکا...... قاری صاحب اکثر سفر میں ہوتے تھے، یا الہ آباد میں ہوتے بھی تو ان کے خدام کی کمی نہیں تھی، ......ان کے چلنے کا انداز اور ان کا والہانہ پن آج بھی جیسے نگاہوں کے سامنے ہو۔

میں نے جو خانقاہ دیکھی تھی……

قاری صاحب بڑے شان وشکوہ والے بزرگ تھے، کسی خانقاہ میں کروفر اور خدام وعشاق کا ہجوم میں نے پہلی بار یہیں دیکھا، میں نے اپنے گھر میں جو خانقاہ دیکھی تھی اس میں مرید مراد اور خادم مخدوم نظر آتے تھے، ہم لوگوں کو مہمانوں کی خدمت پر اس طرح مامور کیا جاتا تھا جیسے ہم ان کے شیخ زادے نہیں بلکہ زرخرید غلام ہوں، پیر طریق بھی اپنی وضع قطع، رہن سہن، اور طرز زندگی میں اتنے سادہ ہوتے کہ ان کے مرید ہی ان سے زیادہ باوجاہت نظر آتے، یہاں نہ کوئی ہٹو بچو تھا اور نہ قیام واحترام، نہ کسی باقاعدہ مجلس کا اہتمام، نہ شیخ طریق سے ملنے کے لئے وقت کی پابندی، نہ سفر کے لئے کسی قسم کا اعلان واہتمام، جب ارادہ ہوا ایک تھیلا ہاتھ میں لیا اور روانہ ہو گئے، کوئی رفیق مل گیا تو بہتر ورنہ اکیلے ہی چل پڑے، نہ سواری، نہ موٹر کار، دیہات دیہات پیدل یا سائیکل یا زیادہ سے زیادہ بیل گاڑی سے سفر ہوتا تھا، ایک عام سی زندگی جس میں بظاہر کسی کو کسی پر فوقیت حاصل نہیں ہوتی، نہ اپنا کام کرنے میں تکلف، نہ دوسروں کا بوجھ اٹھانے میں کوئی عار، کوئی امتیاز نہیں کر سکتا کہ ان میں پیر طریق کون ہے؟……

خانقاہ وصی اللٰہی کا مسند نشیں

لیکن الٰہ آباد میں جب قاری صاحب کی خانقاہ دیکھی تو میرے معصوم ذہن نے فیصلہ کیا آج کے دور میں پیر کی یہی شان ہونی چاہئے، میں نے دیکھا قاری صاحب کا ہر کام ٹکے بندھے اصولوں کے مطابق ہوتا ہے، ہمارا ایک درس مولانا عرفان صاحب سے متعلق تھا اور وہ خانقاہ ہی کے ایک کمرہ میں پڑھاتے تھے، اس لئے خانقاہی معمولات کے مشاہدہ کا براہ راست موقعہ ملتا تھا، مجلس میں بھی کبھی کبھار حاضری ہوتی تھی، اس وقت الٰہ آباد میں اتنی آباد خانقاہ کوئی بھی نہ تھی، اور نہ اس درجہ عوام وخواص کا اعتقاد واعتماد کسی کو حاصل تھا، قاری صاحب سفر میں جاتے تو خواص کی بڑی تعداد رخصت کرنے جاتی، اور جب سفر سے واپس ہوتے تو اسٹیشن پر استقبال کرنے والوں کا ہجوم ہوتا، ایک آدھ بار مجھے بھی اس طرح کے مواقع پر اسٹیشن حاضری کا موقعہ ملا، اور لوگوں کے اژدحام کی وجہ سے میں مصافحہ کی سعادت سے محروم رہا،

حالانکہ اس وقت الٰہ آباد میں ممتاز نقشبندی بزرگ حضرت مولانا محمد احمد پرتا بگڈھیؒ بھی موجود تھے، مگر میری حرماں نصیبی کہ میں نے دو سالوں میں کسی سے ان کا تذکرہ بھی نہیں سنا، حضرت مولانا قمر الزماں صاحب کا نام ایک

بڑے عالم دین اور حضرت شاہ صاحبؒ کی دامادی کی نسبت سے سنا کرتا تھا، ......اس وقت ان کی طرف لوگوں کا رجوع بالکل نہیں تھا، بلکہ وہ خود حضرت پرتا بگڈھیؒ کی دکان معرفت کے خریداروں میں تھے، ......مولانا عمار صاحب مدرسہ بیت المعارف میں استاذ تھے، ان کی الگ سے کوئی پہچان نہیں تھی، غرض اس وقت کا منظر میرؔ کے الفاظ میں :

وہ آئے بزم میں اتنا تو میرؔ نے دیکھا
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

اس وقت وہاں خانقاہ وصی اللّٰہی کے علاوہ کوئی دوسری خانقاہ نہیں تھی اور وصیۃ العلوم کے سوا کوئی دوسرا مدرسہ نہیں تھا، ہر چراغ کو اسی چراغ سے روشنی لینی تھی، ہر خریدار محبت کو اسی دکان سے سودائے دل لینا تھا، ہر دل میں اسی مرد درویش کی محبت جاگزیں تھی جو خانقاہ وصی اللّٰہی کا مسند نشیں تھا، ......

ایک شیخ نقشبند......

یہ اس دور کا الہ آباد ہے جسے میں نے اپنے پڑھنے کے زمانے میں دیکھا ہے، بعد میں اس کا نقشہ ہی بدل گیا، کئی گمنام شخصیتوں کو بام عروج پر پہونچتے دیکھا، حضرت پرتا بگڈھیؒ کی شخصیت شہرۂ آفاق بن گئی، ان کی دکان محبت کا چرچا اتنا عام ہوا کہ الہ آباد میں رہ کر مجھے ان کی زیارت کی توفیق نہ ہوسکی، لیکن دیوبند سے عزم سفر کرکے صرف ان کی زیارت کے لئے الہ آباد حاضر ہوا اور اس کی تحریک حضرت الاستاذ مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحب مفتاحیؒ مفتی دارالعلوم دیوبند کے سفر سے ہوئی، الہ آباد میں حضرت شاہ وصی اللہؒ کا دور ایک بار پھر تازہ ہوگیا، یہ شہر پھر مرجع عوام وخواص بن گیا، ہندوستان کی کون سی بڑی یا چھوٹی علمی یا روحانی شخصیت تھی جس کو حضرت پرتاب گڈھیؒ کی محبت اس شہر میں کھینچ کر نہیں لائی، جس کو دیکھو ان کی محبت میں کشاں کشاں چلا آ رہا ہے، حضرتؒ کی زندگی کا وہ عہد اخیر تھا جب ان کی شخصیت کے آگے ہندوستان کے تمام مشائخ وخانقاہوں کی عظمتیں سرنگوں ہوگئی تھیں، اور ہر شخص ان کا مداح اور ثنا خواں نظر آتا تھا، ......

آج حضرت مولانا قمر الزماں صاحب کی خانقاہ بھی کافی آباد ہے، ......اور حضرت مولانا عمار صاحب کا بھی سلسلۂ بیعت وارشاد جاری ہے......

مولاناؒ خانقاہ وصی اللّٰہی میں

ہمارے مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ کو شروع سے ہی مشائخ چشت اہل بہشت سے طبعی مناسبت تھی، اس لئے غالباً وصیۃ العلوم کی ملازمت کے دوران وہ حضرت قاری محمد مبین صاحب سے بیعت ہو گئے، مولانا قاری صاحب دامت برکاتہم کی اکثر مجالس میں صف اول کے حاضر باشوں میں ہوا کرتے تھے، مولانا کی درسگاہ خانقاہ میں مجلس کی جگہ سے متصل ہی ایک کمرہ میں تھی، اس لئے بھی ان کو صحبت شیخ کے مواقع زیادہ حاصل تھے، شیخ کے حضور مولانا کی تواضع ومسکنت اور ایثار وانکسار قابل دید ہوا کرتی تھی، علاوہ ازیں اوراد واشغال کا جو اہتمام مولانا کے اندر دیکھنے میں آتا تھا، وہ مولانا کی بے نفسی اور زاہدانہ زندگی کی علامت تھی، طلبہ مولانا کے علم کے ساتھ ان کے زہد وتقویٰ کے بھی معترف ومداح تھے۔

اگلے تعلیمی سال (۱۹۸۰ء) میں ہمارے درجہ (عربی اول) کی ایک کتاب (نحو میر) مولانا کے زیر درس آئی اور اس طرح پہلی بار ان کے حلقۂ تلمذ میں داخلہ کی سعادت ملی، لیکن مولانا کے رعب کی بنا پر ان سے بہت زیادہ قربت وانس پیدا نہیں ہوا، ایک تو مولانا کے رعب کی دہشت تھی دوسرے وہاں کے ماحول میں مولانا تنہا محسوس کئے جاتے تھے اور بہت سے طلبہ چاہنے کے باوجود بھی ان سے قریب نہیں ہو پاتے تھے،...... مولانا درس اور صحبت شیخ کے علاوہ باقی تمام اوقات اپنے کمرہ کے اندر لکھنے پڑھنے میں گذارتے، میں اس وقت لکھنے پڑھنے کے مفہوم سے ناآشنا تھا، بلکہ مدرسہ میں عام طور پر اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی تھی، اسی لئے وہاں اکثر طلبہ علمی قابلیت کے باوجود میدان قلم کے شہسوار نہیں تھے اور نہ مولانا کی اس صلاحیت کی کوئی خاص پذیرائی تھی...... وہ تو ہمیں بعد میں پتہ چلا کہ مولانا نے وہاں رہ کر کیسی کیسی قلمی کاوشیں کیں،...... غازی پور میں عنین کے مسئلہ پر اپنی ایک کتاب مجھے دیتے ہوئے فرمایا ”کہ تم دونوں بھائی الٰہ آباد میں باہم لڑنے بھڑنے میں لگے رہتے تھے اور ہم یہ کتاب لکھا کرتے تھے“

قلم وکتاب مولانا کی تنہائی کے رفیق تھے، اہل وعیال سے جو وقت بچ جاتا وہ لکھنے پڑھنے میں صرف کرتے تھے، کبھی ان کو مجلس بازی، سیر وتفریح اور لایعنی مشاغل میں نہیں دیکھا گیا، وہاں کے جوان اساتذہ میں ایسی پابند اور محتاط زندگی گذارنے والا کوئی نہیں تھا،...... کئی لوگ اس کو زاہدانہ تقشّف گردانتے تھے، مگر حقیقت یہ تھی کہ یہ صرف اپنا تحفظ تھا، مولانا کے لئے وہاں کوئی محرم اسرار ہی نہیں تھا جو ان کا ہم رشتۂ درد ہوتا:

اقبالؔ اپنا محرم کوئی نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

ان کی یہ تنہائی صرف اس وقت ٹوٹتی تھی جب مدرسہ یا خانقاہ میں کوئی صاحب علم یا صاحب دل آجاتا تھا ، پھر وہ اپنی خلوت سے نکل آتے تھے اور ایک مجلسی شخص کی طرح ان کے ساتھ بیٹھتے ، علم و حکمت اور اسرار و رموز کی باتیں کرتے ...... مثلاً الہ آباد کے ایک گاؤں (غالباً اتراواں) سے حضرت مولانا محمد فاروق صاحبؒ خانقاہ میں تشریف لاتے تھے ، ان کا علم و فضل زبان زد تھا ، بڑے محقق اور صاحب تصنیف عالم تھے ، حضرت شاہ وصی اللہ صاحبؒ کے متوسلین میں تھے بلکہ غالباً اجازت یافتہ تھے ، ہمارے مولانا کو ان سے بڑی مناسبت تھی ، ان کے ساتھ اکثر بیٹھا کرتے تھے ،

میرے والد ماجد کی الہ آباد آمد

اسی اثنا کا ذکر ہے کہ میرے والد ماجد اپنے ایک رفیق سفر جناب عبدالرؤف صاحب مرحوم (لوٹیا باری ضلع پورنیہ) کے ہمراہ اچانک الہ آباد وارد ہوئے ، وہ دہلی اور سرہند کے ارادہ سے نکلے تھے ، درمیان میں ہم بھائیوں کی محبت میں الہ آباد اتر گئے ، پہلے سے ہمیں اس کی کوئی اطلاع نہیں تھی ، ...... میں اس زمانے میں حضرت قاری مبین صاحب کے گھر کا خادم تھا ، کمسنی کی وجہ سے میرا انتخاب اس کے لئے کیا گیا تھا اور اپنی بے شعوری کے باوجود میں اس کو اپنی سعادت بلکہ عبادت سمجھ کر انجام دیتا تھا ...... والد صاحب کی آمد کی خبر ملی تو میں اس وقت قاری صاحب کی حویلی میں تھا ، میں بھاگا ہوا حاضر ہوا ، والد صاحب مدرسہ والی مسجد میں تھے ، والد صاحب دو دن ٹھہرے ، ...... والد صاحب قاری صاحب دامت برکاتہم سے ملنے کی غرض سے خانقاہ تشریف لے گئے ، وہاں مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ اپنی درسگاہ میں پڑھا رہے تھے ، ہم لوگوں کا سبق اس کے بعد ہی تھا ، قاری صاحب سے ملاقات کے بعد والد صاحب کے قدم ناگاہ ان کی درسگاہ کی طرف مڑ گئے ، مولانا سے کوئی شناشائی نہیں تھی ، ہم دونوں بھائی بھی مولانا کے لئے ایک طرح سے اجنبی ہی تھے ، لیکن نہ معلوم مولانا پر کس کیفیت کا غلبہ ہوا کہ انہوں نے سبق بند کر دیا اور طلبہ کو رخصت کر دیا ، دیر تک دونوں حضرات طریقت و تصوف کے موضوع پر بات چیت کرتے رہے ، ...... حکیم یعقوب صاحب جو اس مدرسہ کے ابن قدیم رہے ہیں اور اس وقت کسی گورنمنٹ لائبریری میں ملازم تھے ، والد صاحب کے ہمراہ تھے ، ان کا بیان ہے کہ کسی

شخص کے لئے انہوں نے پہلی بار اپنے معمولات ترک کئے، ...... پھر والد صاحب کو ہمراہ اپنے کمرہ لے گئے اور دو دنوں تک کی پوری ضیافت اپنے گھر سے انجام دی، اس دوران اکثر ان دونوں بزرگوں کو باہم محو گفتگو دیکھا گیا، بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ مولانا اکثر سراپا گوش نظر آئے، ......

مولانا اعجاز احمد اعظمی ہمارے جد اکبر حضرت مولانا عبدالشکور آہ مظفر پوریؒ کے نام سے واقف تھے، انہوں نے ان کا نام دارالعلوم مئو کے مشائخ حدیث کی فہرست میں دیکھا تھا، مگر اس نسبت سے وہ ہمیں نہیں جانتے تھے، والد صاحب سے پہلی ملاقات میں بھی اس کا ذکر نہیں آیا، ......غرض تاریخی مکمل اجنبیت کے باوجود مولانا قیام الہ آباد کے دوران والد صاحب سے اس قدر متأثر ہوئے کہ نہ صرف یہ کہ دو دنوں کی پوری خدمت وضیافت اپنے ذمہ لی، بلکہ ریلوے اسٹیشن تک خود رخصت کرنے گئے، ٹرین لیٹ تھی تو ڈیڑھ دو گھنٹے اسٹیشن پر ساتھ رہے اور اس دوران بھی مسائل طریقت ہی پر بات کرتے رہے......

منورواتشریف آوری اور مکاتبت

ہم تو اس وقت نادان تھے، لیکن بعد میں والد صاحب اور کچھ مولانا کے خطوط کے ذریعہ اس کی تھوڑی تفصیل معلوم ہوئی، ......مولانا کے اس دور کے کچھ خطوط آج بھی ہمارے پاس محفوظ ہیں، جب مولانا جستجوئے معرفت میں کافی حیران وسرگرداں نظر آتے تھے......اسی سال مولانا نے رجب المرجب کے آخری ہفتہ میں بہار کا سفر اختیار کیا، اور ہمارے یہاں ۲۸/ رجب ۱۴۰۱ھ کو احباب طریق کی مجلس میں شرکت فرمائی، مولانا نے یہاں دو شب قیام کیا، ہم لوگ تو خدام تھے، ہمیں ہم نشینی کا شرف کم ہی ملا، لیکن مولانا کے جذبہ وشوق کی وارفتگی ہم نادانوں سے بھی مخفی نہیں رہ پائی، مولانا نے یہاں سے واپسی پر والد محترم کو اپنے پورے سفر کی تفصیل لکھی، اور غالباً یہ پہلا خط ہے جو مولانا نے الہ آباد سے والد صاحب کو تحریر فرمایا ہے، خط ڈیڑھ صفحہ پر مشتمل ہے، اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ’’مخدومی ومکرمی! یہ تو سفر کی روداد تھی جو میں نے اپنی طبیعت کے خلاف اتنی تفصیل سے لکھدیا تاکہ آپ کو پورا اطمینان حاصل رہے، لیکن حاصل سفر وہی چند لمحات تھے، جو آپ کی صحبت میں بسر ہوئے، میں تو اندھا ہوں اور بے حس بھی، کسی طرح کا ادراک واحساس قطعاً کچھ نہیں ہوا، لیکن مجھے امید ہے کہ کہ نیکوں کی صحبت رنگ ضرور لائے گی، میرے ساتھ تو سنگ بے نمک لیسیدن والا مضمون ہے

، اکثر مجھے اپنی حالت پر افسوس ہوتا ہے، کہ ہائے عمر کا کچھ حاصل نہیں، جس قدر عمر میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، گناہ بڑھتے ہی جاتے ہیں، کمیت میں بھی اور کیفیت میں بھی، آپ جیسے حضرات کی صحبت میں رہ کر یہ احساس اور بڑھ جاتا ہے کہ نیکوں کی پرواز کتنی اونچی ہے، میں غریب اندھا، لنگڑا، اپاہج، بے ہمت، کام چور دن بدن خراب و بدحال ہی ہوتا جارہا ہوں، پرواز ہے مگر معکوس و منکوس، معلوم نہیں میرے بارے میں خدا کو کیا منظور ہے، اگر میری رسوائی و عذاب ہی منظور ہے- خدا کرے ایسا نہ ہو- تو میرا بند بند کانپ جاتا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ مجھے اپنے اوپر سب سے اندیشہ مردودیت و مطرودیت ہی کا ہے، کیونکہ میری معصیتیں حد سے فزوں تر ہیں، اور گستاخی و بے ادبی مزید، لیکن پھر غور کرتا ہوں تو خدا کی شان رحمت و عنایت ہاتھ پکڑتی ہے، کہ بندے مایوس نہ ہو- اب اللہ والوں سے بجز اس کے کیا عرض کروں کہ وہ خدا کے حضور اس بندہ کے متعلق یہی درخواست پیش کریں کہ مردودیت سے بچایا جاؤں، آپ حصرات کی محبت دیکھتا ہوں تو ڈھارس ہوتی ہے کہ دنیا میں آپ نے محبت کی نظروں سے دیکھا ہے، تو امید ہے کہ آخرت میں بھی آنکھیں نہ پھیریں گے- اے کاش میں کوئی جانور رہوتا جسے جنون محبت کی گرانباریوں سے نجات ہوتی، ہائے ہائے دل بیٹھا جاتا ہے،، طبیعت گھبرانے لگتی ہے، آپ میرے لئے صدق دل سے دعا تو کرتے ہی ہیں مگر مکرر درخواست کرتا ہوں کہ للہ اور توجہ کیجئے، اس غریق بحر ظلمات کو ہاتھ پکڑ کر نکالئے، حضرات نقشبندیہ تو غائبانہ توجہ کے ذریعے بھی سالک کو چلاتے رہتے ہیں، (۴/شعبان ۱۴۰۱ھ)

مولانا کی یہ اضطرابی کیفیت ایک دن کی نہیں تھی، بلکہ برسوں مولانا اس میں مبتلا رہے، ۱۴۰۵ھ کے ایک خط میں جب میں دیوبند جاچکا تھا والد صاحب کو تحریر فرماتے ہیں:

”مظہر صاحب (والد صاحب کے ایک قدیم مسترشد اور محرم راز، مقام بڑہروا ضلع سیتامڑھی بہار) نے میرے بارے میں جو کچھ کہا ہے، اس پر ضرور توجہ فرمائیں، آپ صاحب کشف ہیں، کاش کسی ذریعہ سے مجھے یہی معلوم ہوجاتا نسبت مع اللہ حاصل کرنے کے لئے کس آستانہ پر مجھے جانا چاہئے، طبیعت گو اندر سے پرسکون ہے، مگر ایک تشنگی اور پیاس معلوم ہوتی ہے،

اب کے بہار کا سفر ہوگا تو گڑھول شریف جانے کی نیت ہے، اور منورواشریف بھی، آپ حضرات

سے مل کر ایمان میں تازگی آجاتی ہے......حق تعالیٰ آپ کو سلامت با کرامت رکھے، ......(مکتوب ۱۵/ ذی قعدہ ۱۴۰۵ھ)

۱۴۰۶ھ کے ایک خط میں اپنی بے قراری کا حال ان الفاظ میں تحریر فرمایا:

"ملاقات ہوئے بہت عرصہ ہوگیا، آپ ہی کھینچئے، تاکہ ملاقات ہو، میرا تو پروگرام بن بن کر فیل ہوجاتا ہے، آج کل تو کوئی پروگرام بھی نہیں ہے، آپ کے وجود سے بڑی ڈھارس ہے، طبیعت کو قوت رہتی ہے......(مکتوب ۱۵/ جمادی الاخریٰ ۱۴۰۶ھ)

یہ خطوط جو سردست مجھے ہاتھ آ گئے، مولانا کے اس عہد کے کیف دروں کے عکاس اور ان کے اضطراب و بے قراری کے غماز ہیں، ......ان کا سکوت ان کے اندر کے طوفان کا پیش خیمہ تھا، جسے اپنی منزل گم شدہ کی تلاش ہو اسے اپنے گرد و پیش کی کیا خبر؟ ......لوگ اس خاموش مزاجی اور جنون محبت کی گرانباری کو جو نام دینا چاہیں دیں، مگر جس پر گذرتی ہے وہی اس کو بہتر طور پر جانتا ہے، مولانا ڈاکٹر کلیم عاجز کا یہ شعر اکثر پڑھا کرتے تھے، جو ان کے کرب دروں کا آئینہ دار تھا:

تم تو جوانی کی مستی میں کھیل کے پتھر پھینک گئے
جس کو چوٹ لگی ہے پیارے اس کا ہی دل جانے ہے

بہرحال بات چل رہی تھی والد صاحب کی الٰہ آباد آمد کی، والد صاحب کی آمد کے بعد ہم لوگ مولانا کی باقاعدہ سرپرستی میں داخل ہوگئے، اس کے بعد ہم دونوں بھائیوں کا بوریہ بستر مسجد کے کمرہ سے ہٹا کر خانقاہ کے خام مکان میں منتقل کر دیا گیا اور پھر ہمارے پیسے مولانا کے پاس جمع رہنے لگے، جب ہم لوگوں کو ضرورت ہوتی مولانا سے مانگ لیتے، نہ والد صاحب نے بتایا کہ کتنے پیسے مولانا کے پاس جمع کئے ہیں؟ اور نہ مولانا نے کبھی منع کیا، جب ضرورت ہوئی ان سے رقم حاصل کر لی، البتہ وہ ضرورت کی تفصیل ضرور معلوم کرتے تھے۔

میں نے یہ بھی دیکھا کہ والد صاحب سے ملاقات کے بعد مولانا میں غیر محسوس طور پر تبدیلی آئی، ان کا سکوت ٹوٹا، اور ان کی آنکھوں میں امید کی رمق جاگنے لگی، پہلے سفر سے گھبراتے تھے، اب شوق رہ نوردی سے مجبور ہوگئے، پہلے گرد و پیش سے بے خبر تھے اب چہار طرف سے باخبر رہنے لگے،

اب یہ یاد نہیں کہ کیا بات ہوئی جو ہم لوگ اپنا یہ تعلیمی سال پورا ہونے سے پہلے ہی واپس وطن آ گئے، (شاید کوئی فرقہ وارانہ فساد ہوا تھا) رجب کے اواخر میں مولانا منوروا تشریف لائے، والد صاحب کو انہوں نے اپنے پروگرام کی اطلاع دی اور اگلے تعلیمی سال (۱۴۰۱-۲ھ م ۱۹۸۱-۸۲ء) کے لئے میرا قرعۂ فال مدرسہ دینیہ غازی پور کے لئے نکل گیا۔

۲۴/ رمضان المبارک ۱۴۰۱ھ کو والد صاحب کے نام مولانا کا خط آیا جس میں الہ آباد سے اپنی علٰحدگی واستعفا، اور مدرسہ دینیہ غازی پور پہونچنے کی اطلاع دی گئی تھی اور والد صاحب مدظلہ سے غازی پور آنے کی خواہش کا بھی اظہار کیا گیا تھا، غالباً سب کچھ پہلے منوروا میں طے ہو چکا تھا، خط میں اسی کی یاد دہانی کرائی گئی تھی، اور یہ بھی درخواست کی گئی تھی کہ کم از کم دو تین دن کا وقت یہاں دیں۔

غازی پور میں ہمارے قافلہ کی آمد

چنانچہ عید کے بعد ۱۵/ شوال سے قبل ہی ہمارا قافلہ والد ماجد کی قیادت میں غازی پور کے لئے روانہ ہو گیا، جس میں والد صاحب کے چار احباب جناب حاجی مظہر الحق صاحب اوڈیٹر (سیتامڑھی)، جناب حاجی محفوظ الرؤف صاحب (رئیس کملپور اتر دیناجپور بنگال)، جناب ضیاء الحق صاحب (سورجاپور بنگال)، جناب اکرم صاحب (سیوان) اور میرے علاوہ دو اور طلبہ مفتی انعام الحق (مقیم حال گجرات) اور مولوی شرافت ابرار (مقیم حال کلکتہ) شامل تھے، سب سے پہلے ہمارے سات رکنی قافلہ نے شوکت منزل میں پڑاؤ ڈالا،...... اسی سال اس کا افتتاح بھی ہوا جس میں حضرت والد صاحب کی دعا پر مجلس کا اختتام پذیر ہوئی اور عربی درجات کو مرکز کی قدیم عمارت سے یہاں منتقل کیا گیا، عربی ہفتم کا اجراء بھی اسی سال ہوا،...... اور ظاہر ہے کہ اس ترقی میں حضرت مہتمم صاحب دامت برکاتہم کی دلچسپی کے علاوہ بڑا دخل مولانا اعجاز صاحب کی شہرت تدریس اور حسن اخلاق کا تھا، مجھے خوب یاد ہے کہ اس افتتاحی نشست میں حکیم یوسف صاحب مرحوم (جو مہتمم صاحب کے ہمدرد دواخانہ میں بیٹھتے تھے) نے ایک طویل تہنیتی نظم پڑھی تھی، جس کی ہر بند اس مصرعہ پر ٹوٹتی تھی:

ع مولوی اعجاز جب آئے الہ آباد سے

شوکت منزل- جہاں میری کتنی یادیں آسودۂ خواب ہیں

گنگا کے کنارے عرض مستطیل پر یہ پرشکوہ اور وسیع وعریض عمارت مدرسہ دینیہ کو جناب ڈاکٹر شاہ شوکت اللہ انصاری (سفیر ہند متعینہ سوڈان) کی بیوہ محترمہ زہراء بیگم انصاری صاحبہ اور ان کے صاحبزادگان کی طرف سے ۱۳۹۸ھ میں ہبہ کے طور پر حاصل ہوئی، لیکن مرمت اور ضروری تیاریوں کے بعد اس میں عربی درجات کا افتتاح شوال ۱۴۰۱ھ میں ہوا، یہ رہائشی طرز کی عمارت تھی جو پہلے امراء اور نوابان اپنے لئے بنوایا کرتے تھے، کئی چھوٹے بڑے صحن، بہت سے کمرے، گیلریاں اور دالان وغیرہ، انتہائی پرفضا مقام، پوری عمارت اس خوبصورتی سے بنائی گئی تھی، کہ ہر طرف سے گنگا کی موجوں کا نظارا کیا جاسکتا تھا اور اس کی جانب سے آنے والی تازہ ہواؤں سے لطف اندوز ہوا جاسکتا تھا، ......گیلری میں یا مدرسہ کی چھت پہ کھڑے ہوں تو گنگا کی حدنگاہ سطح آب پر ابھرتی ہوئی موجیں سمندر کا سماں پیش کرتی ہیں، میرا شعور اتنا بلند نہیں تھا، پھر ندیاں اور تالاب ہمارے لئے کوئی نئی چیز نہیں تھی، ہمارا علاقہ دریاؤں کے سنگم میں واقع ہے، جس کو دریاؤں کی کثرت نے سہ آبہ میں تبدیل کردیا ہے اور تقریبا ہر سال ہی یہاں کے لوگوں کو دریائی قہر وعتاب کا سامنا کرنا پڑتا ہے، میری پیدائش نانیہال میں ہوئی اور وہ وہاں عبور دریا کے بعد ہی پہونچا جاسکتا تھا، خود میرا گاؤں پہلے لب دریا (کرے ندی کے کنارے) واقع تھا، مگر دریا کی قہر سامانیوں سے تنگ آکر ۱۹۶۴ء میں پورے گاؤں کو باندھ کے دوسری طرف نسبتاً محفوظ مقام پر منتقل ہونا پڑا، ...... یہ ندیاں قدوقامت میں مختصر ہونے کے باوجود انسانی آبادیوں کے لئے ایسی تباہ کن رہی ہیں کہ اکثر ان کے کنارے سے گذرتے ہوئے میں سوچا کرتا تھا:

اسی دریا سے اٹھتی ہیں وہ موج تند وجولاں بھی
نہنگوں کے نشیمن جس سے ہوتے ہیں تہ وبالا

مگر یہاں نہنگوں کے نشیمن نہیں انسانی آشیانے نشانہ بنتے تھے، ......

گنگا کا تاریخی ساحل

لیکن جب میں نے غازی پور میں دریائے گنگا کا سطح بے کراں دیکھا، تو ہمارے یہاں کی ساری ندیاں اس کے سامنے بے معنیٰ نظر آئیں، پھر جب مجھے معلوم ہوا کہ تقریباً پونے دوصدی قبل حضرت سید احمد شہید رائے بریلویؒ کا

قافلۂ قدس ادھر سے دوبار گذرا ہے، تو اس کی موجوں کے ساتھ میری عقیدت کا رشتہ بھی وابستہ ہوگیا، ……

’’سید صاحبؒ ۱۲۳۶ھ مطابق ۱۸۱۶ء میں سفر حج پر روانہ ہوئے تو آپ کا قافلہ زمانیہ ہوتے ہوئے ۱۱/محرم الحرام ۱۲۳۷ھ کی صبح غازی پور پہونچا اور ۱۳/محرم الحرام تک تین دن یہاں قیام کیا، پھر دو سال دس ماہ کے بعد جب آپ واپس ہوئے تو چھ دن تک غازی پور میں قیام فرمایا، اور ان دونوں سفروں میں ہزاروں بندگان خدا کو اس چشمۂ ہدایت سے فیضیاب ہونے کا موقعہ ملا، ……تاریخ کا بیان یہ ہے کہ سید صاحب کو یہاں خوشبوئے دوست کھینچ لائی تھی، کہتے ہیں کہ جب سید صاحب کی کشتیاں عظیم آباد (پٹنہ)، داناپور ہوتے ہوئے رائے بریلی کے لئے روانہ ہوئیں اور بھوج پور، ہلسار، بھیرا اور بکسر ہوتے ہوئے محمد آباد پہونچیں تو آپ محمد آباد سے ایک دوسری طرف چل پڑے، لوگوں نے دریافت کیا تو کہا کہ مجھے دوست کی بو آتی ہے، …… یہ تھے یوسف پور کے نواب شیخ فرزند علی جو اس وقت بہت بیمار اور کمزور تھے انہوں نے یوسف پور میں آپ کا زبردست استقبال کیا، اپنے تمام اہل وعیال کو بیعت کرایا اور پھر آپ کی ہمراہی میں اپنے بچوں سمیت غازی پور کے لئے روانہ ہوئے، دوسرے دن یہ کشتیاں غازی پور کے ساحل پر آ کر رکیں اور شیخ فرزند علی کے مکان (محلّہ قاضی ٹولہ) پر سید صاحب نے اپنے قافلہ کے ساتھ مسلسل چھ روز تک قیام فرمایا، شہر کے لوگ بکثرت بیعت ہوئے، شہر کی جامع مسجد جو ویران ہو چکی تھی آباد ہوئی اور پانچ وقت پابندی کے ساتھ نماز ہونے لگی۔

(سیرت سید احمد شہید ص۳۷۲ مؤلفہ مولانا سید ابوالحسن ندویؒ وخصوصی شمارہ دین ودعوت ص۸ تا ۱۰ مرتبہ مولانا عزیزالحسن صدیقی مہتمم مدرسہ دینیہ غازی پور)

اور یہ ایک عجیب اتفاق یا نظام غیبی ہے کہ نواب فرزند علی نے اپنے اسی مکان سے متصل جہاں سید صاحب نے قیام فرمایا تھا ایک مسجد بھی بنوائی تھی، جس میں سید صاحب نے بھی غالباً نمازیں پڑھی ہونگی، اسی مسجد میں ایک سو چودہ سال کے بعد ۱۳۵۰ھ میں حضرت مولانا عمر فاروق قاسمیؒ (م۱۳۶۳ھ) نے مدرسہ دینیہ کی بنیاد رکھی، پھر جب اس مدرسہ نے ترقی کی تو محلّہ زیر قلعہ میں اس مقام پر منتقل ہوگیا جہاں آج مدرسہ کی مرکزی عمارت موجود ہے، (رسالہ دین ودعوت ص۱۳، ۱۴)

مدرسہ کی مرکزی عمارت سے قریب ہی وہ اسٹیمر گھاٹ ہے جہاں غالبًا سید صاحبؒ کی کشتیاں لنگر انداز ہوئی تھیں، قاضی ٹولہ محلّہ بھی اسی سے متصل ہے، ......

☆ اسی گھاٹ پر عالم خیال میں میں نے شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کا قافلہ بھی اترتے ہوئے دیکھا، جن کا شہر کے بڑے مجمع نے استقبال کیا تھا، شیخ الہند کی سواری کے گھوڑے کھول دیئے گئے اور خود اہل شہر نے اس سواری کو کھینچ کر منزل تک پہونچایا تھا، شیخ الہندؒ کا یہ تاریخی سفر قید مالٹا سے رہائی کے فوری بعد پیش آیا تھا۔

(رسالہ دین ودعوت ص ۱۵)

غازی پور کی تاریخی اہمیت

شہر غازی پور پہلے بھی علم وعلماء کا مرکز رہا ہے:

☆ ۱۸۶۲ء میں سرسید احمد خان صدر اعلیٰ بن کر آئے تھے، کہتے ہیں کہ وہ اپنے عظیم تعلیمی مشن کا آغاز اسی سرزمین سے کرنا چاہتے تھے، جیسا کہ ان کی بعض تعلیمی سرگرمیوں سے اندازہ ہوتا ہے، یہاں انہوں نے ۱۸۶۳ء میں سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی، اوراس سوسائٹی کے ذریعہ مغربی علوم کی اہم کتابوں کو ہندوستانی زبانوں میں منتقل کرنے کا پروگرام بنایا، یہیں دوران قیام انہوں نے تاریخ فیروزشاہی کی تکمیل کی، ایک رسالہ ”التماس بہ خدمت ساکنان ہند درترقی تعلیم“، یہیں سے جاری کیا، تبیین الکلام فی تفسیر التوراۃ والانجیل علیٰ ملۃ الاسلام“ (جس کی تصنیف وہ ۱۸۶۱ء ہی میں کرچکے تھے) کی پہلی جلد ۱۸۶۲ء میں غازی پور سے شائع کی، اس کتاب کو چھاپنے کے لئے انہوں نے ہزاروں روپے خرچ کرکے رڑکی سے پریس منگوایا تھا، اس سوسائٹی کے کوئی دوسو ہندو اور مسلمان ممبر تھے، جس میں غازی پور سمیت پورے ملک سے نمائندگی دی گئی تھی، یہیں انہوں نے تزک جہانگیری کا متن بھی لکھا اوراس کا ابتدائی حصہ یہیں چھپوایا...... یہاں انہوں نے ۱۹۶۴ء میں ایک مدرسہ کی بھی بنیاد ڈالی جو بعد میں وکٹوریہ اسکول کے نام سے مشہور ہوا یہ ساری چیزیں اس سرزمین کے تعلق سے ان کے ارادوں کو بتاتی ہیں، لیکن تقدیر نے ان کو علی گڑھ پہونچادیا، اوران کا مشن علی گڈھ تحریک کے نام سے مشہور ہوا (مشاہیر غازی پور ص ۸۵ تا ۸۷ مصنفہ مورخ کبیر مولانا عزیز الحسن صدیقی مہتمم مدرسہ دینیہ غازی پور)

☆ غازی پور میں ایک مدرسہ چشمۂ رحمت کافی قدیم مانا جاتا ہے، جس کو ۱۸۶۹ء میں مولانا رحمت اللہ فرنگی

محلیؒ نے قائم کیا تھا، کہتے ہیں کہ پہلے اس مدرسہ پر خیر کا غلبہ تھا، اور یہاں علماء حق کی بڑی تعداد رہتی تھی، (حوالۂ بالا) لیکن ہم نے جس دور میں اسے دیکھا وہ گورنمنٹ سے ملحق ایک زوال پذیر ادارہ تھا، اور بریلوی مکتب فکر کا ترجمان تھا ، اور وہاں محبت سے زیادہ نفرت کی تعلیم دی جاتی تھی،

☆اسی طرح بقول صدیقی صاحب دامت برکاتہم :

> ’’اردو کو علمی وادبی زبان بنانے کا پہلا کام اردو کی تاریخ میں اور ہندوستان بھر میں غازی پور ہی میں شروع ہوا تھا، اور یہ کام وقتی نہیں تھا، بلکہ براہ راست اسی تحریک کے زیر اثر آگے چل کر کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج وجود میں آیا، جان گل گرسٹ نیل کی کاشت کے سلسلہ میں ۱۷۸۲ء میں (فورٹ ولیم کالج کے قیام سے پہلے) غازی پور میں تھے، اور یہیں انگریزی اردو اور اردو انگریزی ڈکشنری تیار کی، ۱۷۹۰ء میں یہ لغت زیور طباعت سے راستہ ہوئی، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غازی پور کا ماحول علمی وادبی کاموں کے لئے ہمیشہ سازگار رہا ہے اور مختلف علوم وفنون سے وابستہ لوگ یہاں آتے جاتے رہے ہیں، ڈاکٹر علی شیر خان نے اپنے تحقیقی مقالہ ’’اردو ادب کے ارتقاء میں غازی پور کی خدمات‘‘ کے پیش لفظ میں اعتراف کیا ہے، کہ ’’دراصل غازی پور میں اردو شاعری کا آغاز سترہویں صدی میں ہو چکا تھا، یہ وہ زمانہ تھا جب کہ اردو زبان وادب اپنے ابتدائی مراحل سے گذر رہے تھے
>
> (مشاہیر غازی پور ص ۹۱، ۹۲)

غرض ملک السادات سید امیر مسعود غازی (م ۷۶۷ھ) کا یہ شہر غازی پور جس نے ۷۳۰ھ سے آج تک مسلسل سات صدیوں کی سینکڑوں بہاریں دیکھیں، علم وکمال کی بے شمار تاریخیں اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے، کہتے ہیں کہ یہاں پر قریب میں (غوث پور کے مقام پر) کوئی پرانا تالاب تھا جہاں کا پانی بہت گدلا اور غلیظ تھا، لیکن راجہ ’’ماندھاتا چکوئی‘‘ کا مرض جذام اسی گدلے پانی سے حیرت انگیز طور پر اچھا ہو گیا تھا، بس راجہ نے یہیں پر ڈیرا ڈال دیا ، لیکن بعد میں اس کے ظلم وستم اور عیاشیوں سے تنگ آ کر دہلی کی شہنشاہیت کو اس کے خلاف قدم اٹھانا پڑا اور ملک السادات مسعود غازی کے ذریعہ اس فتنہ کا قلع قمع کیا گیا، پھر ملک السادات نے یہاں ایک نئے شہر کی بنیاد رکھی، جو ان کی نسبت سے غازی پور کے نام سے مشہور ہوا، مسعود غازی کی قبر غازی پور کے محلّہ سید راجے میں ہے جس کو اب محلّہ

ہری شنکر بولتے ہیں، یہ جگہ محلّہ میاں پورہ سے قریب ہی ہے، جہاں مدرسہ دینیہ کی شوکت منزل والی عمارت واقع ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے مشاہیر غازی پور ص ۲۹ تا ۴۰)

لیکن فکر وفن، علم وکمال اور رنگ ونور کا یہ تاریخی اور عظیم شہر اب تقریباً اجڑ چکا ہے، اس کی رونق ماند پڑ چکی ہے، چہل پہل رخصت ہو چکی ہے، حضرت مولانا ابوالحسن صدیقی غازی پوریؒ کے الفاظ میں:

> ’’اب تو یہ کھنڈرات کا ایک مرقع بن کر رہ گیا ہے، شہر کی آبادی گھٹتے گھٹتے پچاس ہزار کے قریب رہ گئی ہے، مگر نصف صدی پہلے اس میں وہ ساری چہل پہل تھی جو کسی شہر میں پائی جاسکتی تھی، محلے آباد تھے، کاروبار ترقی پر تھا، یہاں کے بسنے والے فارغ البالی کی زندگی بسر کرتے تھے، دور دراز مقامات سے لوگ تبدیلی آب وہوا کی غرض سے یہاں آیا کرتے تھے، نامور اطباء یہاں مقیم تھے، اچھی سوسائٹی تھی، اچھے لوگ تھے، شعر وادب کی مجلسیں گرم رہا کرتی تھیں، اچھے اساتذہ تھے، اچھے علماء تھے، اچھے صوفیاء تھے، گلی کوچے صاف اور سڑکیں ہموار تھیں، رقبہ بھی اس کا بہت بڑا تھا، ۱۸۷۹ء میں بلیا کو غازی پور سے الگ کر دیا گیا، (تاریخ غازی پور از مسٹر ایچ آرنول) اس کے علاوہ اور بہت سے زرخیز علاقے وقتاً فوقتاً قریبی اضلاع کو منتقل کئے جاتے رہے مثلاً پرگنہ مہائچ بنارس کو (غازی پور تاریخ کی روشنی میں مؤلفہ مولانا ابوالحسن صدیقیؒ، مشاہیر غازی پور ص ۲۳، ۲۴)

غازی پور کا یادگار سرمایہ- مدرسہ دینیہ

اب اگر غازی پور کے پاس کوئی یادگار سرمایہ بچ گیا ہے تو وہ ہے مدرسہ دینیہ غازی پور اور اس کی سطح سے ہونے والی خدمات، ہم جس دور میں وہاں پہونچے تھے اس وقت نہ صرف غازی پور ضلع میں بلکہ کئی اضلاع میں اس معیار اور شہرت کا کوئی مدرسہ نہ تھا، معیار تعلیم تو درجہ عربی ششم تک ہی تھا، لیکن لائق وفائق اساتذہ، بکثرت ذہین طلبہ کے رجوع اور وہاں کے خاص تعلیمی وتربیتی ماحول نے اس کو ایک آئیڈیل مدرسہ بنا دیا تھا، اتنا خوبصورت تعلیمی ماحول اور طلبہ میں پڑھنے لکھنے کا ذوق فراواں کم از کم میں نے اس سے پہلے کہیں نہیں دیکھا بلکہ اس کے بعد بھی آج تک کسی تعلیمی ادارہ میں وہ دیکھنے کی حسرت باقی رہی، اساتذہ تو شب زندہ دار ہوتے ہی تھے میں نے رات رات بھر وہاں طلبہ کو بھی کتابوں سے چپکا ہوا دیکھا ہے، جبکہ مدرسہ کے پاس تعلیمی وسائل کی فراوانی نہیں تھی، نہ روشنی کا خاص نظم تھا اور نہ

بیٹھنے کے لئے خاطر خواہ فرش میسر تھے، لیکن موم بتی (جو طلبہ اپنے طور پر خرید تے تھے) کی روشنی میں طلبہ اپنی آنکھیں کتابوں میں گاڑے رہتے تھے، نہ ان کو گرمی کی پرواہ تھی اور نہ سخت ٹھنڈی کا احساس، ایک دو سال کے بعد ہمارے دوست مولانا محمد ابوذر قاسمی جو اس وقت وہاں پڑھتے تھے کلکتہ سے مٹی تیل والا دو عدد پیٹرومیکس لے آئے، اس دن ہماری خوشیوں کی انتہا نہ تھی کہ اب ہم کم از کم مغرب سے عشا تک کا تعلیمی سفر پیٹرومیکس کی تیز روشنی میں طے کرسکیں گے، عشا کے بعد کا اللہ مالک ونگہبان ہے،

ایک یادگار رات

مجھے خوب یاد ہے، مجھے ایک بار قدوری (درجہ عربی سوم میں فقہ کی مشہور نصابی کتاب) پڑھنی تھی، عشا کے بعد روشنی کا انتظام نہیں ہوسکا اور میری غربت کسی موم بتی یا چراغ کی ممنون کرم نہیں تھی، بقول علامہ اقبالؒ:

ترا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

اتفاق سے آسمان پر تیرھویں شب کا چاند روشن تھا، فضا بالکل صاف تھی، خدا شاہد ہے میں نے اسی چاند سے روشنی مانگی اور مدرسہ کی چھت پر تنہا بیٹھ کر اسی ٹھنڈی چاندنی میں قدوری کا مطالعہ شروع کیا، اور جب میری شب نے سحر کی تو میری کتاب اختتام پذیر ہو رہی تھی، اذان فجر کے آخری کلمات کے ساتھ میری کتاب کی آخری سطر بھی پوری ہوگئی، اس رات کے لذت مطالعہ کو آج بھی یاد کرتا ہوں تو پورا وجود شرسار ہو جاتا ہے، سوچتا ہوں کاش میری پوری زندگی اسی شب کی اسیر ہو جاتی، وہ شب پھیل جاتی یا زندگی ٹھہر جاتی، پڑھنے کا وہ کیف وسرور مجھے پھر کبھی حاصل نہیں ہوا ،......اور سب سے عجیب بات یہ تھی کہ اس کی خبر تک میں نے اپنے اساتذہ کو نہیں ہونے دی، نہ میں نے مدرسہ کی طرف سے انتظامی کمی کا شکوہ کیا بلکہ حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہیں آئی،......ایسے مواقع پر ہم چھپ کر پڑھتے تھے تاکہ اپنا فقر بھی بے آبرو نہ ہو اور مدرسہ کی انتظامی پریشانیاں بھی آشکار نہ ہوں،......نہ ہمارے لئے کھانے پینے کا کوئی مسئلہ تھا اور نہ رہنے سہنے کا، ہمارے ذہن ودماغ پر صرف ایک ہی خیال سوار رہتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ پڑھنے کی کیا صورت ہوسکتی ہے؟......

مدرسہ دینیہ کا خوبصورت تعلیمی ماحول

طلبہ میں پڑھنے کی ایسی لگن تھی کہ ان کو اساتذہ کی نگرانی کی بھی حاجت نہ تھی، وہ اپنے ذوق وشوق سے رات رات بھر پڑھتے تھے اور ایک استاذ بھی ان کی نگرانی کے لئے موجود نہیں ہوتا تھا، ...... بعض ساتھی تو اس درجہ مغلوب الحال تھے کہ مدرسہ کی چھت پر جمعہ کی صبح جو پڑھنے بیٹھے تا آفتاب نصف النہار تک پہونچ گیا، سخت گرمی کا موسم ، تیز چلچلاتی دھوپ میں ان کا پورا بدن شرابور ہو گیا، لیکن اللہ کے بندہ کو کوئی خبر نہیں ہوئی، ناشتہ کا وجود نہیں تھا اس لئے دو پہر کے وقت ہی ان کو تنبہ ہوا، ...... یہ کوئی افسانہ نہیں، زندہ حقیقت ہے اور اس کی گواہی دینے والے لوگ موجود ہیں،

مجھے آج بھی یاد ہے، میرے وہاں قیام کا غالباً دوسرا یا تیسرا سال ہوگا، مدرسہ وصیۃ العلوم الہ آباد سے حضرت مولانا محمد نعمان صاحب معروفیؒ مدرسہ دینیہ غازی پور ملاقات کی غرض سے تشریف لائے، شب انہوں نے حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ کے اس کمرہ میں قیام کیا جو فوقانی منزل پر گنگا کی طرف منہ کئے ہر سرد وگرم کا سامنا کرنے کے لئے تنہا کھڑا تھا، گرمی کا موسم، مولانا کی چارپائی کمرہ کے باہری حصے میں ڈال دی گئی تھی، عشاء کی نماز کے بعد وقفہ بڑھا، شب کا سکوت گہرا ہوتا چلا گیا، گنگا کی موجیں بھی اب محوخواب ہونے لگی تھیں، رات کے دس بجے، گیارہ بجے ، بارہ سے کانٹا آگے چلا گیا، مولانا کروٹ پہ کروٹ بدل رہے ہیں، گرمی کی چھوٹی رات، مولانا چاہتے تھے کہ کم سے کم ایک بجے تہجد کی نماز سے فارغ ہو جائیں، مگر طلبہ کے قال یقول کی صدائیں تھمنے کا نام نہیں لیتی تھیں، ان کو کیا خبر کہ کسی کو ان کی خاموشی کا انتظار بھی ہے؟...... رات کے دو بج گئے، ...... میں گذرتا ہوا ادھر چلا گیا، ...... مولانا بے چین تھے ، میں نے تھوڑی خدمت کی، مولانا نے پوچھا، یہ طلبہ کب سوئیں گے؟ میں نے کہا کہ حضرت ان کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے، جب ان کے پڑھنے کا جنون کمزور ہوگا نیند ان کو دبوچ لے گی، ...... مولانا نے بے ساختہ کہا کہ:

’’پڑھنے کا یہ خوبصورت ماحول اور طلبہ کا یہ ذوق وشوق عہد ماضی کی یاد دلاتا ہے، ہمارے یہاں الہ آباد میں یہ ماحول نہیں ہے اور میں نے آج تک کسی جگہ یہ ماحول نہیں دیکھا، مجھے امید ہے کہ یہ بچے آفتاب و ماہتاب بن کر چمکیں گے‘‘

مدرسہ دینیہ کے اساتذۂ باکمال

اور ظاہر ہے کہ اس ماحول کو بنانے میں انتظامیہ کے خلوص کے علاوہ ہمارے اساتذہ کا بڑا حصہ تھا، اس وقت کے اساتذہ میں ناظم تعلیمات حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ کے علاوہ حضرت مولانا عبد الرب صاحب جہانا گنجی حال ناظم مدرسہ انوار العلوم جہانا گنج، حضرت مولانا صفی الرحمٰن صاحب دربھنگوی حال صدر المدرسین مدرسہ اسلامیہ شکر پور بھروارہ دربھنگہ، حضرت مولانا انوار احمد صاحب خیرآبادی صاحب تصانیف کثیرہ حال استاذ حدیث وتفسیر جامعہ اسلامیہ مظفر پور اعظم گڑھ، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن معروفی حال استاذ مدرسہ کوپا گنج، حضرت مولانا رفیع الدین صاحب قاسمی حال صدر المدرسین مدرسہ اسلامیہ شاہ جنگی بھاگلپور، اور حضرت مولانا مختار احمد خیرآبادی موجودہ صدر المدرسین مدرسہ دینیہ غازی پور سب کی محنت ولگن اور آہ سحر گاہی کے نتیجے میں یہ ماحول وجود میں آیا تھا، ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ ایک انجمن تھا، جس کا ظہور وہاں سے نکلنے کے بعد زیادہ ہوا، بڑی ناسپاسی ہوگی اگر اس وقت کے صدر المدرسین حضرت مولانا مشتاق احمد غازی پوریؒ کا ذکر نہ کیا جائے، ظاہر ہے کہ صدر المدرسین کا کردار سب سے کلیدی ہوتا ہے، وہ مرکز کی عمارت میں رہتے تھے، شوکت منزل کبھی کبھی تشریف لاتے تھے، ان سے مجھے تلمذ کا شرف حاصل نہیں ہوا، لیکن ان کی للٰہیت وبے نفسی اور مدرسہ کے تعلق سے ان کی فکر مندی بے نظیر تھی، اکثر کسی مہمان زائر کے ساتھ ہی وہ آتے تھے، وہ مدرسہ کی ہر ترقی سے خوش ہوتے تھے اور اونچے الفاظ میں اس کا ذکر کرتے تھے،......ان کے علاوہ جناب مولانا جلال الدین صاحبؒ اور جناب قاری شبیر احمد صاحب دربھنگوی (حال ناظم مدرسہ اسلامیہ شکر پور بھروارہ ضلع دربھنگہ) بھی خاص طور پر قابل ذکر ہیں یہ حضرات بھی مرکز کی عمارت میں رہتے تھے، اس لئے ہمارا ان سے کوئی خاص واسطہ نہیں پڑتا تھا، مگر یہ دونوں شخصیتیں بھی گوناگوں کمالات کی مالک تھیں اور مدرسہ میں ریڑھ کی ہڈی کا درجہ رکھتی تھیں،

مولانا اعجاز احمد صاحب کی مردم ساز شخصیت

مگر ان سب میں ماحول ساز شخصیت مولانا اعجاز احمد اعظمی کی تھی، وہ ناظم تعلیمات تھے، تمام اساتذہ ان کا احترام کرتے، ان کا مشورہ مانتے تھے اور ان کے علمی تفوق کے قائل تھے، وہ انسانوں کے نبض شناش اور ماہر نفسیات تھے، وقت کی نزاکتوں کو خوب سمجھتے تھے، ہر طرح کے علوم وفنون پر بھی دستگاہ رکھتے تھے، تقریر وتحریر دونوں پر ان کو یکساں

قدرت تھی، ان کے مواعظ سیدھے دل میں اترتے محسوس ہوتے تھے، ہر جمعہ کو بعد نماز فجر طلبہ میں وعظ فرماتے، جس میں تعلیم وتعلم، شخصیت سازی، اور علماء وطلبہ کی ذمہ داریاں جیسے حساس موضوعات پر مؤثر گفتگو فرماتے تھے، بزرگوں کے واقعات تو ان کے نوک زبان تھے، ہر موقعہ کی رہنمائی کے لئے ان کے پاس حکایات وواقعات کا بڑا ذخیرہ ان کے حافظہ میں موجود تھا، اس پر انداز بیان کی چاشنی سونے پر سہاگہ کا کام کرتی تھی، اسی سے ماحول بنتا تھا، ......اس پر مزید ان کی وجاہت، خداترسی، قوت انجذاب، اور اضطراب وبے قراری مہمیز کا کام کرتی تھیں، وہ خود بھی اپنے خطابات کا بہترین عملی نمونہ تھے، کتابوں اور اصحاب علم سے بڑھ کر ان کا کوئی دوست نہیں تھا، ان کا پورا وقت پڑھنے پڑھانے ، مطالعہ وتحقیق، اور تحریر وتصنیف میں گذرتا تھا، اس وقت ان کے عوامی خطابات کا سلسلہ شروع نہ ہوا تھا، جلسوں میں بہت کم شرکت کرتے تھے، بعد میں جب ان کے شاگردوں کا حلقہ وسیع ہوا تو مختلف علاقوں میں شاگردوں سے تعلق اور وہاں کی دینی ضروریات کی بناپر ان کو سفر کرنا پڑا اور پھر اسفار کا مستقل سلسلہ شروع ہوگیا، لیکن ہمارے زمانۂ طالب علمی میں ان کی ساری توجہات کا محور طلبہ ہوتے تھے، اپنی صلاحیتیں طلبہ میں منتقل کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا، اور ان کو اپنے سے بہتر دیکھنا ان کی دلی تمنا ہوتی تھی، ان کے اسی جذب اور کرب کا اثر تھا کہ ان کے بے پناہ علمی اشتغال اور رکھ رکھاؤ اور جاہ وجلال کے باوجود طلبہ ان سے مربوط رہتے تھے، طلبہ کے ہر مسئلہ کے لئے ان کے وقت میں گنجائش ہوتی تھی، وہ ہر طالب علم کے لئے اپنے دل میں درد رکھتے تھے، ہر طالب علم کے مسئلہ کو اپنا مسئلہ سمجھتے تھے، طلبہ کے گھریلو معاملات سے بھی واقفیت رکھتے تھے اور مناسب مشورے دیا کرتے تھے، ان کی خوشی اور غم میں برابر شریک رہتے، حافظہ اتنا غضب کا تھا کہ نہ صرف کتابی عبارتیں بلکہ طلبہ کی صورتیں اور ان سے متعلق باتیں بھی ہر وقت ان کے ذہن میں مستحضر رہتی تھیں، خواہ کتنے ہی عرصہ کے بعد ملاقات ہو فوراً پہچان لیتے تھے، یہ آسان بات نہیں ہے، آدمی برسوں ساتھ رہنے کے بعد بھی لمبے عرصے کے لئے بچھڑ جاتا ہے تو صورتیں ذہن سے محو ہو جاتی ہیں۔

مولانا کی یہی وہ خصوصیات تھیں جن کی بدولت وہ دلوں پر حکمرانی کرتے تھے، ان کے اشاروں پر طلبہ جان دیتے تھے، جب تک کسی استاذ کو اس درجہ محبوبیت حاصل نہ ہو وہ طلبہ میں انقلابی تعمیر کا کام انجام نہیں دے سکتا، وہ مرد آہن اور مرد انقلاب تھے، جن کے یہاں کوئی گھن گرج نہیں، کوئی شور ہنگامہ، کوئی طوفان نہیں، کوئی نعرۂ انقلاب نہیں مگر دل ودماغ کی کایا پلٹ جاتی تھی، گردوپیش میں طلب وجستجو کی ایسی خوشبو پھیل جاتی کہ ہر ایک علم کا دیوانہ ہو جاتا تھا

، ایسا ماحول بن جاتا کہ نہ پڑھنے والا بھی پڑھنے پر مجبور ہوتا، نہ چاہنے والے دلوں میں بھی چاہت کی لہریں اٹھنے لگتیں، ...... ہر انسان اپنی صلاحیتوں اور اپنے ذوق وشوق سے آگے بڑھتا ہے، علم محنت سے حاصل کیا جاتا ہے، اس کو گھول کر پلایا نہیں جا سکتا، لیکن مولانا کی استاذی کا کمال یہ تھا طالب علم اتنی تیزی سے بدلتا اور ترقی کرتا کہ تھوڑی دیر کے لئے یہ گمان ہوتا کہ شاید علم کا محلول اس کو پلا دیا گیا ہو، ...... علم تو عطیۂ الٰہی ہے، وہ مولانا کے اختیار میں نہیں تھا، لیکن وہ علم کا نشہ چڑھانا ضرور جانتے تھے، وہ اپنے زور بیان اور قوت کردار سے طلبہ پر ایسی بے خودی طاری کر دیتے تھے کہ طلبہ اپنی منزل کی طرف بے تکان دوڑ پڑتے تھے، بگڑے سے بگڑے ماحول کو بنانا اور مردہ دلوں میں زندگی کی رو پیدا کر دینا ان کے خم وابرو کا کھیل تھا، وہ مسلمانوں کے اس طبقۂ شباب میں جس سے پوری ملت اسلامیہ کی امیدیں وابستہ ہیں ایسا جوش عمل بھر دیتے تھے کہ ان کی منزل سات ثریا کی بلندی پر بھی ہو تو اس کو پانے کی وہ کوشش کرتے تھے اور اس کے لئے جسم وجان کی ساری راحتیں قربان کرنے اور بڑی سے بڑی مشکلات کا سامنا کرنے کو تیار ہو جاتے تھے، میں نے ڈاکٹر اقبال کا یہ شعر پہلی بار مولانا کے طریقۂ کار سے ہی سمجھا:

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں
نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

استاذ کامل کی صفات

میں پورے برصغیر کی بات نہیں کرتا لیکن جہاں تک میرا مشاہدہ وتجربہ ہے، ملک وبیرون ملک کے سفر میں مختلف مدارس وشخصیات کی زیارت کا موقعہ ملا ہے، اس کی روشنی میں کہہ سکتا ہوں، استاذ کامل کی جو صفات مولانا کی شخصیت میں دیکھیں وہ کہیں نظر نہ آئی، معاملہ قابلیت وصلاحیت کا نہیں اور نہ شب بیداری وزہد وتقویٰ کا، نہ شاہکار تحریروں اور دھواں دھار تقریروں کا، استاذی اور مردم سازی کا ہے،

ایک استاذ کا اصل کمال یہ ہے کہ وہ اپنا فن اپنے شاگردوں میں اپنے سے بہتر طور پر منتقل کر دے، یعنی علم وکمال کو نقطۂ جامد کی طرح نہیں بلکہ شعلۂ جوالہ کی صورت میں منتقل کرے، جس کی بلندئ پرواز صرف اس کی عظمت کی

دلیل نہ ہو بلکہ ایک پوری نسل اور جماعت اس پرواز میں شریک ہو،...... جس کی نگاہ طلبہ کی ذہنی صلاحیتوں کے ساتھ ان کی اخلاقی اقدار پر بھی ہو،...... ان کے خاندانی پس منظر اور اقتصادی حالات سے بھی واقف ہو،...... تعلیم و تربیت کے لئے خون جگر صرف کرنے کا جذبہ بھی رکھتا ہو اور سلیقہ بھی،...... طلبہ کے ساتھ انفرادی طور پر فکرمندی بھی ہو اور دردمندی بھی، ساز دل بھی رکھتا ہو اور سوز جگر بھی،...... ذاتی زندگی بھی اس کی مثالی ہو اور اجتماعی زندگی بھی، اس کی زندگی نور ایمانی اور خوف خدا کی آئینہ دار ہو،...... اس کا طرز عمل پیغام عمل دینے والا ہو، وقتی ہیجان پیدا کرنے والا نہیں،...... اس کو دیکھنے سے زندگی کا حوصلہ ملتا ہو مایوسی نہیں، جس کے شاگرد اس کے اشاروں پر ہفت خواں طے کرنے کا حوصلہ رکھتے ہوں، جو گرکر بھی اٹھ جانے کی ہمت رکھتے ہوں، بقول شاعر:

؎ اس طرح طے کی ہیں ہم نے منزلیں
گر پڑے، گر کر اٹھے، اٹھ کر چلے

کسی شخص میں ان میں سے کوئی ایک بات بھی پیدا ہو جائے، تو اس کی استاذی کے لئے کافی ہے، لیکن اگر یہ تمام باتیں کسی ایک فرد میں جمع ہو جائیں تو وہ استاذ کامل بن جاتا ہے اور وہ فرد نہیں، انجمن اور اس کا لمحہ لمحہ ایک ایک صدی کے برابر ہوتا ہے،...... ہمارے مولانا اعجاز صاحب بھی انہی خوش نصیب افراد میں تھے، جن کو قدرت کی طرف سے استاذی کے یہ تمام کمالات ودیعت کر دیئے گئے تھے، اسی لئے ان کی شخصیت ایک جماعت اور ان کی حیات ایک عہد کے برابر تھی:

؎ بہت لگتا تھا جی صحبت میں ان کی
وہ اپنی ذات سے ایک انجمن تھے

دوسری جانب شاگردوں اور اصحاب تلمذ کی طرف سے جو محبت و گرویدگی ان کو ملی اور ان کے شاگردوں نے ان کے نظریۂ تعلیم و تربیت کے تعلق سے جس عملی صداقت کا مظاہرہ کیا کہ شاید ایسے خوش نصیبوں کو آج ہندوستان میں انگلیوں پر گنا جا سکے، عہد قدیم میں اس کی مثالیں بہت ملتی ہیں، مولانا اِس دور میں اُسی قافلۂ قدس کے بچھڑے ہوئے شہسوار تھے جو آخر اپنے کارواں سے جا ملا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مدرسہ دینیہ میری نگاہ میں

میرا علم اور میری صلاحیت کیا، مولانا کے بلند پرواز شاگردوں میں میری حیثیت ہی کیا، لیکن بطور اعتراف اور جذبۂ تشکر کے کہتا ہوں کہ مطالعہ وتحقیق اور تحریر وتقریر کا جو بھی ٹوٹا پھوٹا سلیقہ مجھے حاصل ہوا اس میں مدرسہ دینیہ کے اس چار سالہ قیام کا بنیادی حصہ ہے، بعد کے تمام ادوار تکمیلات وتحسینات کے ہیں، بنیادیں اسی شوکت منزل کی چہار دیواریوں میں قائم ہوئیں جو آج بھی میرے خوابوں اور خیالوں کی منزل اور میری تمناؤں اور آرزوؤں کا مسکن ہے، میری زندگی کے قیمتی ماہ وسال وہاں گذرے ہیں، وہاں میرا بچپن عہد شباب سے ہم آغوش ہوا ہے، اسی آب وہوا نے مجھے قوت پرواز بخشی، اسی دریا کی موجوں نے مجھے تیرنا سکھایا، خود کلامی اور خدا کلامی میں نے وہیں کے ذرات سے سیکھی، وہیں کے بام ودر اور شام وسحر میرے چوبیس گھنٹوں کے رفیق رہے، جو میرے غمگسار بھی تھے اور شریک درد بھی، مجھے جو بھی دیا اسی ماحول نے دیا،......

میں نے مدرسہ دینیہ کا وہ دور عروج پایا ہے، جس کو تاریخی تسلسل نہیں تاریخی ارتعاش کہنا زیادہ بجا ہوگا، جس کی تعمیر ایک مرد درویش کی نگاہ مؤمنانہ اور ایک مرد غیور کے عزم قلندرانہ کا نتیجہ تھی، جو وہاں کے باغباں کے خوابوں کی تعبیر تھی، جس میں اس کا اور اس کے رفقاء کار کا خون جگر پیوست ہوا تھا، میں مدرسہ دینیہ کے اس نقطۂ ارتقاء کا ساتھی ہوں جہاں ایک جنبش قدم صدیوں کے سفر کے لئے کافی ہوتی تھی، جس کے لمحوں میں وہ برکت تھی جو آج برسوں کو حاصل نہیں ہے، جہاں مسافروں کی نقل وحرکت کے آگے ماہ وسال کی گردشیں تھم جاتی تھیں، یہ مدرسہ دینیہ کا وہ عہد زریں تھا جب نہ ساقی کو کوئی بخل تھا اور نہ رند میں تکان، نہ جام وجم کی گردشیں رکتی تھیں اور نہ میخواروں کا جمگھٹا کم ہوتا تھا، جب میخانہ لبریز تھا، بادہ خواروں کی بھیڑ تھی، جب طلبہ میں یہ جذبہ موجزن ہوا کرتا تھا:

؎ ہمیں گھر سے کیا مطلب، مدرسہ ہے وطن اپنا
مریں گے ہم کتابوں میں، ورق ہوگا کفن اپنا

میخانہ آج بھی اسی طرح قائم ہے، مگر وہ بادہ خوار نہیں، ساقی ایک ایک کر کے رخصت ہوتے جا رہے ہیں، جیسے موتی کا پرویا ہوا ہار ٹوٹ گیا ہو، اب نہ وہ اہل ہنر ہیں نہ وہ اہل طلب،......

مولاناؒ کی زندگی کا عہد زریں

مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ اسی سلسلۂ زریں کی شاندار کڑی تھے، مولانا کی زندگی کا بھی یہ عہد زریں تھا، ان کی مردم ساز شخصیت کے جو کمالات اس دور میں ظاہر ہوئے وہ پھر دیکھنے میں نہیں آئے، یہاں مولانا نے جو افراد تیار کئے وہ ان کی پوری زندگی کا حاصل ہیں، یہاں سے نکلنے کے بعد مولانا کی شخصیت میں وسعت پیدا ہوئی، عوامی خدمات کا دائرہ بڑھا، درسیات کی اونچی کتابیں پڑھانے کو ملیں، ایک محقق ومصنف کی حیثیت سے ان کا تعارف عام ہوا، ان کی چھپنے والی تحریروں پر بڑے بڑے ادیبوں نے سر دھنے، شاندار تبصرے لکھے، ان کی کتابوں نے اہل علم وتحقیق سے قیمتی خراج تحسین وصول کئے، شخصیت کے وقار میں اضافہ ہوا اور ان کی عظمت میں چار چاند لگے، ......لیکن پھر ....

مصروفیات اتنی بڑھیں کہ افراد سازی کا وہ سلسلۂ زریں مدھم پڑ گیا جو ان کا خاص امتیاز تھا اور جس کی وجہ سے وہ جہاں بھی جاتے ان کے گرد طلبہ کا ہجوم ہو جاتا تھا، طلبگاروں کو ان کے اندر اسی استاذ کی تلاش تھی جو غازی پور میں نظر آئے تھے، ......ارباب جستجو ان کی اسی شخصیت کی کھوج میں رہے، جو غازی پور کے افق پر چمکتی ہوئی دکھائی دی تھی، ......بادہ خوار اپنے اسی ساقی کی طلب میں بھٹکتے رہے جو رسم میکشی سے بالاتر ہو کر دل ونگاہ کو مخمور کرنے کا فن جانتا تھا، ......لیکن مولانا کا دائرۂ عمل اتنا وسیع ہو گیا تھا، ان کے کاندھوں پر اتنی ذمہ داریاں آ گئی تھیں اور وہ آفاق کی ان وسعتوں میں جا پہونچے تھے جہاں ہر طلبگار کی رسائی ممکن نہ تھی، ......اب ان سے فیض وہی لوگ پا سکتے تھے جو اس ظرف کے حامل ہوں اور اتنی قوت پرواز رکھتے ہوں۔

مولانا کا طریقۂ تعلیم وتربیت

یوں تو میں مولانا کے گوناگوں کمالات کا ہر طرح مداح اور معتقد ہوں لیکن ان کے جس وصف نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ تھا ان کا یہی طریقۂ تربیت اور مردم سازی کی صلاحیت، ......میرے نزدیک یہ وصف بیش بہا آج دنیا سے عنقا ہوتا جا رہا ہے، اس وصف میں مولانا کو جو کمال واختصاص حاصل تھا وہ سراسر انعام الٰہی تھا، وہ نرم دم گفتگو اور گرم دم جستجو کے قائل تھے، افہام وتفہیم بھی جانتے تھے اور تنبیہ وسرزنش بھی،

☆ایک بار ایک طالب علم کو اتنا مارا کہ اس کے سر سے خون بہنے لگا، یہ دیکھ کر مولانا خود بھی روئے وہ طالب علم بھی رویا اور سارا مدرسہ رویا، رونے رلانے کا یہ دورانیہ قریب ایک گھنٹہ کا رہا، آج بھی اس منظر کو سوچتا ہوں تو مجھے

حیرت ہوتی ہے کہ ایک شخص کے جذبۂ انفعال نے سارے ماحول کو سوگوار کر دیا...... مولانا کا یہی امتیاز تھا، انتہائی جذبات میں بھی وہ خوف خدا سے غافل نہیں ہوتے تھے،...... بہادر شاہ ظفرؔ کے اس شعر کے مصداق:

ظفرؔ اس کو نہ آدمی جانئے گا، چاہے وہ ہو کتنا ہی صاحب فہم و ذکا
جسے طیش میں خوف خدا نہ رہے، جسے عیش میں یاد خدا نہ رہے

میرے قطبی پڑھنے کا قصہ

☆ یہ تو تربیت کا نمونہ تھا اب طریقۂ تعلیم کی ایک مثال دیکھئے، میں درجہ عربی چہارم کا طالب علم تھا، منطق کی مشہور کتاب قطبی داخل درس تھی، جو مولانا سے متعلق تھی، کچھ اسباق پڑھانے کے بعد ان کو احساس ہوا کہ یا تو اس کتاب سے طلبہ کی دلچسپی کم ہے یا یہ ان کی ذہنی سطح سے بالاتر ہے، مولانا نے کہا اس طرح پڑھانے سے کیا فائدہ؟ انہوں نے اسباق بند کر دیئے،...... مجھے بڑا احساس ہوا کہ ایک اہم معقولی کتاب کے درس سے میں محروم ہو گیا، ابتدا میں مجھے منطق سے یوں بھی دلچسپی بہت زیادہ تھی، میرا خیال تھا کہ یہ فن صرف ذہین ترین لوگوں کا ہے اور جو منطق کی کتابیں نہیں پڑھے گا اس کی ذکاوت میں اضافہ نہیں ہوگا،...... میں نے اپنے جد اکبر حضرت مولانا عبدالشکور آہ مظفر پوریؒ کے بارے میں اپنے بزرگوں سے سنا تھا کہ کئی سال تک انہوں نے منطق وفلسفہ کی کتابیں پڑھیں، جس کی وجہ سے ان میں وہ خود اعتمادی پیدا ہوئی کہ دارالعلوم دیوبند کے داخلہ امتحان میں اپنے ممتحن (حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، اور تاج المحدثین حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ) کے سامنے ذرا مرعوب نہ ہوئے، بلکہ اپنی حاضر جوابی اور ذہانت وذکاوت سے ممتحنین کو متأثر کر دیا،...... میں نے سوچا یہ تو میرا خاندانی فن ہے اس سے دستبردار ہونا مناسب نہیں، میں نے مولانا سے دوبارہ اسباق شروع کرانے کی درخواست کی، لیکن مولانا نے توجہ نہ دی، جب میں نے اصرار کیا تو انہوں نے کہا کہ اب تو سبق بند کر چکا ہوں اس لئے دوبارہ شروع نہیں کر سکتا، البتہ اگر تم پڑھنا چاہتے ہو تو عشا کی اذان سے آدھ گھنٹہ قبل وقت دے سکتا ہوں، البتہ یہ میرے لکھنے پڑھنے کا وقت ہے، اس لئے میں باقاعدہ پڑھاؤں گا نہیں، البتہ تم مطالعہ کر کے آؤ اور اپنا حاصل مطالعہ سناؤ، میں اس کی تصحیح وتصویب کر سکتا ہوں اور کہیں دقت ہوگی تو سمجھا بھی دوں گا،...... چنانچہ اسی طرح ہوا، تصورات کا پورا حصہ میں نے پندرہ دنوں میں پڑھ لیا جس میں مولانا کو بہت کم بولنے اور سمجھانے کی نوبت آئی، جب تصدیقات شروع ہوئی تو مولانا نے یہ کہہ کر سبق بند کر دیا کہ اب

پڑھانے کی ضرورت نہیں ہے خود ہی مطالعہ کرڈالو...... اللہ کی قدرت، جب میں دارالعلوم دیوبند میں معین مدرس ہوا اور مجھ سے قطبی کے اسباق متعلق ہوئے تو وہاں تصدیقات ہی کا حصہ داخل نصاب تھا، جو اس حقیر طالب علم نے خود مطالعہ کرکے پڑھاڈالا اور مولانا کے یہ الفاظ میرے سامعہ سے روز ٹکراتے رہے کہ ”تمہیں پڑھانے کی ضرورت نہیں ہے خود مطالعہ کرڈالو...... اللہ پاک نے مولانا کے ان لفظوں کی لاج رکھ لی،

ع　　　وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

علوم قاسمی کی طرف توجہ

☆ایک بار نہ معلوم کیسے میرے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ مسلمان اپنے آپ کو خدا پرست کہتے ہیں جبکہ ان کا رخ بھی اپنی نمازوں میں خانہ کعبہ کی طرف ہوتا ہے اور کعبہ پتھر کے بنے اس گھر کا نام ہے جسے اسی دنیا کے انسانوں نے بنایا ہے، اگر نماز میں قبلہ درست نہ ہو تو نماز نہیں ہوتی، حالانکہ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ خدا زمان ومکان کی قید سے ماوراء ہے، قرآن کہتا ہے اینما تولوا فثم وجه الله (جدھر بھی رخ کرو اللہ ہی ہے) پھر نماز میں قبلہ کی قید کیوں ہے؟ کہیں یہ بت پرستی کی مشابہت تو نہیں؟......

اس زمانے میں اس طرح کے اوٹ پٹانگ سوالات میرے ذہن میں بکثرت پیدا ہوتے تھے، جو مطالعہ سے نہیں بلکہ سوچ سے پیدا ہوتے تھے،...... میں نے ایک دن درس کے ختم پر مولانا کے سامنے یہ سوال رکھا،...... مولانا نے میرا سوال بڑی توجہ کے ساتھ سنا اور اس کا جواب دینے کے بجائے الماری میں رکھی ایک کتاب میری طرف بڑھائی اور کہا تمہارے سوال کا جواب اس کتاب میں ہے،...... وہ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی کتاب قبلہ نما تھی،...... ارشاد ہوا کہ اس کتاب کو غور سے پڑھو اور جو سمجھ میں آئے وہ مجھے بھی آکر بتاؤ،......

اس طرح مولانا کی عنایت سے پہلی بار مجھے علوم قاسمی کی طرف توجہ ہوئی، میں نے عربی چہارم ہی کے سال حضرت نانوتویؒ کی یکے بعد دیگرے مدرسہ کی لائبریری میں موجود تمام کتابیں پڑھ ڈالیں، جو رہ گئیں ان کے پڑھنے کا شوق دل میں موجزن رہا، میری دلی خواہش تھی کہ دیوبند جانے سے پہلے بانی دیوبند سے علمی مناسبت پیدا کرلی جائے ،...... دیوبند داخلہ کے بعد سب سے پہلے میں نے حضرت نانوتویؒ کی بقیہ کتابیں تلاش کیں، اسی ضمن میں حضرت کی فارسی کتاب مصابیح التراویح کا میں نے اردو ترجمہ کرڈالا،......

آب حیات دیوبند کی مارکیٹ میں دستیاب نہیں تھی میں نے ایک صاحب کے ذریعہ پاکستان سے منگوائی ، مولانا کو میری اس دلچسپی کا علم ہوا تو بلا طلب ازراہ عنایت کچھ پیسے بھی بھیج دیئے اور لکھا یہ تمہارے لئے ہدیہ ہے، آب حیات کو سمجھنے میں بڑی دقت پیش آئی میں نے مولانا سے عرض کیا تو مولانا نے لکھا رمضان کی چھٹی میں بھیرہ (مولانا کا آبائی گاؤں) چلے آؤ، میں نے بھی وہ کتاب صرف آدھی پڑھی ہے، آدھی کے بعد سر چکرانے لگا تو چھوڑ دیا تھا، آجاؤ اس بہانے ہم بھی وہ کتاب پڑھ لیں گے، ...... لیکن ایک گھریلو ضرورت پیش آجانے کی وجہ سے رمضان میں وقت نہ نکل سکا، ......

اسی زمانہ میں میں نے حضرت مولانا خلیل احمد سہارن پوری کی کتاب البراہین القاطعہ پڑھی اور امکان کذب باری کے مسئلہ پر مجھے بہت سی تشویشات پیش آئیں، اسی سلسلے میں وہ علمی مراسلت ہوئی جس کا ایک حصہ مولانا نے ”حدیث دوستاں“ میں محفوظ کر دیا ہے،

اسی دور میں دیہات میں نماز جمعہ کے مسئلہ پر حضرت نانوتویؒ کے ایک فارسی مکتوب کا میں نے ترجمہ کیا ، جس میں حضرتؒ نے دلائل کے ساتھ جمعہ کے بارے میں حنفیہ کے موقف کو واضح کیا ہے اور بحالات موجودہ دیہاتوں میں جمعہ کے جواز بلکہ وجوب کا رجحان پیش فرمایا ہے۔

حضرت نانوتویؒ کی زیادہ تر کتابیں مجھے کتب خانہ رحیمیہ دیوبند سے دستیاب ہوئیں، ہمارے قیام دیوبند کے زمانے میں وہاں کے مالک غالباً مولانا اسحاق صاحب تھے، بڑے باذوق صاحب علم تھے، اگر چیکہ ان کا کتب خانہ اب تاریخ کا حصہ بنتا جا رہا تھا اور دوسرے پروفیشنل کتب خانے مارکیٹ پر چھا رہے تھے، لیکن نادر مطبوعات کا بیشتر ذخیرہ وہیں ملتا تھا، ہر سال دارالعلوم میں امتیازی نمبرات حاصل کرنے والے طلبہ کو بھی وہ اپنی طرف سے انعامات دیتے تھے، مجھے مولانا اسحاق اور ان کے کتب خانہ سے بڑی مناسبت تھی، میں اکثر عصر کے بعد ان کے یہاں چلا جاتا، اور کتابوں اور اوراق بوسیدہ کے انبار میں اس طرح کی چیزیں تلاش کرتا رہتا تھا۔

مجھے خوب یاد ہے کہ ایک بار مولانا دیوبند تشریف لائے، علوم قاسمیہ سے میری مناسبت اور میری بعض تحریروں کو دیکھ کر انہوں نے رسالہ دارالعلوم دیوبند میں ان کی اشاعت کی ترغیب دی اور خود مدیر رسالہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی دامت برکاتہم سے اپنے قدیم تعلق کی بنا پر میرے مضامین شائع کرنے کی سفارش بھی فرمائی

، چنانچہ اس کے بعد عرصہ تک رسالہ دارالعلوم میں میرے مضامین کا سلسلہ ''معارف قاسمیہ'' کے نام سے جاری رہا، مضامین چھپتے رہے اور میں خوش ہوتا رہا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ سب پود انہی کی لگائی ہوئی تھی،

؎ بہار اب جو گلشن میں آئی ہوئی ہے
یہ سب پود انہی کی لگائی ہوئی ہے

میرا شوق مطالعہ

☆ میرا شوق مطالعہ بھی مولانا ہی کی دین ہے، غازی پور میں میرے قیام کا دوسرا سال تھا، میں عربی سوم میں آچکا تھا لیکن سوائے اپنے پڑھے ہوئے اسباق کے اگلے اسباق یا خارجی مطالعہ کی توفیق نہیں ہوتی تھی، اسی طرح میں عشاء کی نماز کے بعد پڑھنے اور جاگنے کا قائل نہیں تھا، میں مدرسہ کے ذہین ترین لڑکوں میں شمار کیا جاتا تھا، اس لئے مغرب کے بعد ساتھیوں کو پڑھے ہوئے اسباق کی تکرار میں ہی کراتا تھا، عشا تک ساری کتابوں کے تکرار سے فارغ ہوجاتا تھا اور میرا اپنا حال یہ تھا کہ بوقت درس ہی سارے اسباق یاد ہوجاتے تھے، اس لئے بھی عشا کے بعد جاگنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی، مدرسہ کے تمام طلبہ پابندی کے ساتھ عشاء کے بعد پڑھتے تھے، لیکن میں فوراً بستر پر دراز ہوجاتا اور طلبہ کے ہنگاموں میں بھی مجھے نیند آجاتی تھی، ......

ایک دن کافیہ کے درس میں مولانا سے میں نے ایک سوال کیا، اس کا جواب حاشیہ میں موجود تھا، مولانا نے کہا تمہارا کا جواب حاشیہ میں موجود ہے، حاشیہ فارسی میں تھا، سمجھ میں نہیں آیا، مولانا نے کہا جاؤ کل اس کو سمجھ کر آنا ، میرے ذہن پر مولانا کا رعب اتنا تھا کہ ان کا کوئی حکم میرے لئے ٹالنا آسان نہیں تھا، میں نے مغرب کے بعد تکرار سے بچے ہوئے وقت کو اس کے لئے استعمال کیا لیکن وہ ناکافی ثابت ہوا، بالآخر زندگی میں پہلی بار عشا کے بعد کتاب لیکر بیٹھنے کی خفت گوارا کی اور قریب ڈیڑھ گھنٹہ کی دماغ سوزی کے بعد چار سطری حاشیہ کسی حد تک سمجھ میں آیا، ......اس دن سے عشا کے بعد اگلے سبق کی تیاری کا معمول بن گیا، پھر شاید ہی کبھی ایسا ہوا کہ اگلا سبق سمجھنے کے لئے مجھے استاذ کی تقریر کی ضرورت رہی ہو، بنیادی مضامین میرے ذہن میں ہوتے تھے، استاذ سے ان کی تعبیرات وتشریحات حاصل کرتا تھا، نیز اپنے فہم کی توثیق بھی ہوتی تھی، ......پھر تو مجھے ایسی مشاقی ہوگئی کہ عبارت کی خواندگی سے ہی استاذ کو اندازہ ہوجاتا تھا کہ یہ طالب علم عبارت سمجھ کر پڑھ رہا ہے۔

اس ضمن میں عربی پنجم کے سال کا ایک واقعہ خاص طور سے قابل ذکر ہے، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن فتحپوری دامت برکاتہم مولانا کے دوستوں میں ہیں، اس زمانہ میں وہ غالباً مدرسہ امدادیہ ممبئی کے مفتی تھے اور آج مہاراشٹر کے مفتی اعظم ہیں، وہ کافی علیل ہوکر غالباً تبدیلی آب وہوا کی غرض سے ایک ماہ سے بھی زیادہ شوکت منزل کی پرفضا عمارت میں قیام کیا، رات میں ان کا قیام بالائی منزل پر مولانا کے حجرۂ خاص میں ہوتا تھا، ایک دن ہم لوگ ہدایہ کے سبق کے لئے حاضر ہوئے تو مولانا کی طبیعت مضمحل تھی، مولانا لیٹے ہوئے تھے، مفتی صاحب سے کہا: آپ پڑھادیں، مفت صاحب راضی ہوگئے، میں نے عبارت پڑھی، درس کے اختتام پر مفتی صاحب نے میرا تعارف پوچھا اور کہا کہ تمہاری عبارت خوانی سے ہی مجھے اندازہ ہوگیا تھا تم یہ سبق پہلے ہی سے سمجھے ہوئے ہو، اور پھر بطور انعام اپنی جیب سے پانچ روپئے نکال کردیئے۔

میری قلمی زندگی کا آغاز

☆ یہ قلم جو آج چل رہا ہے یہ بھی ہاتھ میں انہی کا پکڑایا ہوا ہے، طلبہ کی تحریر وتقریر کی مشق کے لئے مدرسہ دینیہ میں تہذیب البیان کے نام سے انجمن قائم تھی، ہر جمعرات کو اس کے ماتحت مغرب کے بعد پروگرام ہوتے تھے، طلبہ کے دو گروپ تھے، دونوں کے ذمہ داران طلبہ میں سے منتخب کئے جاتے تھے، مولانا انجمن کے نگران اعلی تھے، ذمہ دار طالب علم کو معلن کہا جاتا تھا، اور یہ ساری ذمہ داریاں خود مولانا کی نگرانی میں تقسیم کی جاتی تھی، میں عربی سوم میں تھا، طلبہ کے ایک گروپ کا معلن حافظ عبداللہ صاحب کو بنایا گیا جو عربی پنجم کے طالب علم تھے اور ان کا نائب مولانا نے مجھے نامزد فرمایا، ......، ساتھ ہی مولانا نے یہ بھی فرمایا کہ ہر ہفتہ طلبہ کی ترغیب وتحریص کے لئے تحریر وتقریر کی افادیت پر جو چند سطری اعلان نکلتا ہے، وہ لکھنا بھی تمہاری ذمہ داری ہوگی، ...... میں کانپ کر رہ گیا ایک تو میری عمر بہت کم تھی، بمشکل بارہ یا تیرہ سال، دوسرے میری طبیعت کم آمیزی کی طرف مائل تھی، ...... مگر مولانا کے حکم کے سامنے کون پر مار سکتا تھا......، اس طرح بالجبر میرے ہاتھ میں قلم پکڑایا گیا، ......

یہ سال میرے لئے بڑی آزمائشوں کا رہا، ایک ہی موضوع پر ہر ہفتہ نئی تعبیرات وعنوانات کے ساتھ مضمون تیار کرنا آسان بات نہ تھی اور سب سے مشکل مرحلہ اس کو مولانا کی نگاہ سے گذارنے کا تھا، مولانا کی تصحیح ومنظوری کے بغیر کوئی مضمون آویزاں نہیں کیا جاسکتا تھا اور اس پر تاکید یہ کہ اتوار تک اعلان آویزاں ہوجانا چاہئے

، تاکہ طلبہ کو تیاریوں کا موقعہ مل سکے، میں ہی جانتا ہوں کہ ہر ہفتہ اس مضمون کو تیار کرنے میں کتنے ہفت خواں مجھے طے کرنے پڑتے تھے...... اور وہ گھڑی شاید میرے لئے قیامت کی ہوتی تھی، جب ٹوٹی پھوٹی بچکانہ تحریر کو لیکر میرے قدم مولانا کے حجرہ کی طرف بڑھتے تھے، اگر وہ مضمون کاٹ چھانٹ کے بعد بھی پاس ہو جاتا تو میں اپنے لئے نئی زندگی محسوس کرتا تھا، ...... نہ معلوم مجھے اس کے لئے کتنی ریاضتیں اور کتنی کتابوں کی ورق گردانیاں کرنی پڑی، کس کس وادی کی خاک چھاننی پڑی، لیکن کبھی ہمت نہیں ہاری اور نہ اپنی پونجی کے بارے کوئی خوش فہمی پیدا ہوئی، ہمیشہ اپنا سکہ کھوٹا محسوس ہوا......

آزمائشوں بھرا یہ سال میری قلمی زندگی میں شاہ کلید کی حیثیت رکھتا ہے، لمحہ لمحہ کرب میں مجھے علم وادب کی کیسی کیسی فتوحات حاصل ہوئیں، فکر ونظر کے کتنے دریچے وا ہوئے، ذہن وتخیل کو کیا کیا بلند پروازیاں نصیب ہوئیں؟ ہاتھ میں دیئے گئے قلم پر میری گرفت کیسی مضبوط ہوئی؟ اور ایک مفلس بے نوا کو لوح وقلم کی کتنی مملکتیں عطا کی گئیں؟...... میرے پاس جذبۂ تشکر اور احساس ممنونیت کے اظہار کے لئے الفاظ نہیں ہیں، ...... اس میں رب العالمین کے فضل وکرم کے ساتھ میر کارواں کی نظر کرم بھی شامل رہی، اللہ پاک ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے، ہم جیسے کتنے ہی مس خام کو کندن اور ناکندہ تراشوں کو پیکر حسن ومعنیٰ بنادیا:

ننگ میخانہ تھا میں ساقی نے یہ کیا کر دیا
پینے والے کہہ اٹھے یا پیر میخانہ مجھے

مولانا کی وسیع النظری

مولانا کا ایک بڑا امتیاز ان کی وسیع النظری ہے، علاقائی عصبیت کے بالکل قائل نہ تھے، ان کے روابط ہر علاقہ کے لوگوں سے تھے، ہندوستان میں مشرق ومغرب اور شمال وجنوب ان کے لئے برابر تھے، خاص طور پر اہل بہار سے ان کو بڑا تعلق تھا، ان کا اصل حلقۂ علمی بھی یہی تھا، جن ممتاز اصحاب علم ورشد سے ان کو گہری وابستگی تھی ان میں بھی اکثریت اہل بہار کی تھی، بہار کے لوگوں نے بھی ان کی جو قدر ومنزلت پہچانی شاید اتنی بڑی سطح پر کسی اور علاقہ کو یہ خصوصیت حاصل نہ ہوئی، ......

بہار پھر اپنی پہلی تاریخ کی طرف واپس آئے

بہار کے موجودہ علمی زوال، دینی کمزوری اور جہل وظلمت کے عموم وشیوع پر وہ بہت رنجیدہ تھے، ان کی خواہش تھی کہ بہار پھر اپنی پہلی تاریخ پر واپس آجائے، اس گلشن میں پھر وہی بادنو بہار چلے جو صدیوں قبل اس سرزمین کی پہچان مانی جاتی تھی، جہاں ہر رنگ ونور کے پھول کھلتے تھے، ہر طرف قمریوں اور بلبلوں کی صدائے دلنواز گونجتی تھی، ہر علم وفن کا درس یہاں ہوتا تھا، ملک وبیرون ملک کے تشنگان علم یہاں آتے تھے اور اسلامی ہندوستان کو جب کبھی کوئی علمی مشکل درپیش ہوتی تو علماء بہار اس کو حل کرنے کے لئے آگے بڑھتے تھے،

قدیم ہندوستان کی علمی تاریخ میں بہار ایک مرکز علم کی حیثیت سے معروف تھا اور پورے ہندوستان کے لئے سرمایۂ افتخار تھا، حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ نے مولانا غلام علی آزاد بلگرامیؒ کی ''مآثر الکرام'' اور حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی ''اخبار الاخیار'' کے حوالوں سے لکھا ہے کہ:

''حضرت شاہ ولی اللہؒ کے دودمان عالی کے مشہور بزرگ شیخ عبدالعزیز شکر بارؒ کے دادا شیخ طاہرؒ نے تحصیل علم کے لئے ملتان سے بہار کا سفر کیا اور شیخ بدھ (یا بودھن) حقانیؒ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا، (اخبار الاخیار ص ۱۹۵، مآثر الکرام ص ۴۳)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قدیم ہندوستان میں بہار علم کا بڑا مرکز تھا، اور دور دراز سے لوگ تحصیل علم کے لئے یہاں آتے تھے، اور خاص بات یہ تھی کہ ابتدا سے لیکر انتہائی درجات تک کی مکمل تعلیم کا یہاں معقول انتظام تھا، اسی لئے یہاں کے طلبہ کو تحصیل علم کے لئے بہار سے باہر جانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی، ملا موہن بہاریؒ جو بعد میں شہزادہ اورنگ زیبؒ کے استاذ ہوئے آزاد بلگرامیؒ کے بقول ان کی اول سے آخر تک تعلیم بہار ہی میں ہوئی، اور یہاں ان کے علم کی شہرت ہی سے متاثر ہوکر بادشاہ شاہجہاں کی توجہ ان کی جانب ہوئی، (دیکھئے مآثر الکرام ص ۴۳)

ملا احمد سعیدؒ مفتی عساکر شاہجہانی کے بارے میں معروف ہے کہ وہ بہار کے تھے اور ان کی پوری تعلیم بہار ہی میں ہوئی تھی اپنے والد ملا سعدؒ سے تعلیم حاصل کی، (بادشاہ نامہ ج ۲) بہار کی اس علمی خودمختاری کا اعتراف حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے بھی کیا ہے، لکھا ہے کہ:

بہار مجمع علماء بود (نظام تعلیم وتربیت ص ۴۸)

ترجمہ: بہار سر برآوردہ علماء کا مرکز تھا

علامہ مناظر احسن گیلانیؒ علامہ شوق نیمویؒ کے بارے میں لکھتے ہیں:

’’آپ کا اسم گرامی مولانا ظہیر احسن اور تخلص شوقؔ تھا، حدیث خصوصاً نقد رجال میں ان کا جو پایہ تھا اس کا اندازہ اسی سے ہوسکتا ہے کہ حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ ان کی دقت نظر کے مداحوں میں تھے، آپ ’’نیمی‘‘ بہار میں پیدا ہوئے، اور مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ سے درس نظامیہ کی تکمیل کر کے پٹنہ میں مطب کے ساتھ ساتھ تالیف وتصنیف کا کاروبار شروع کیا، آثار السنن کے چند ابتدائی حصے ملک میں شائع ہوئے کہ سارے ہندوستان میں دھوم مچ گئی، لیکن افسوس عمر کم پائی، کتاب ناتمام رہی، پھر بھی جتنا حصہ شائع ہو چکا ہے، حنفی مدارس میں بعضوں نے اس کو نصاب کا جزوقرار دیا ہے، یہ کتاب حنفی مکتب خیال کی تائید میں محدثانہ اصول پر مرتب کی گئی ہے، علامہ تھانویؒ نے اس کا تکملہ بھی کرایا ہے، مولانا شوقؒ اردو زبان کے بڑے نامور شعراء میں تھے، جلال لکھنویؒ سے زبان کے مسئلے میں تحریری مناظرہ بھی کیا تھا، جس میں مولانا ہی کی جیت ہوئی تھی، ایک بڑی دردناک مثنوی اردو میں لکھی ہے، اور بھی بیسیوں کتابوں کے مصنف ہیں (ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت، حاشیہ ص۳۵۳)

خود میں نے حضرت مولانا عبدالرحمٰن دربھنگویؒ امیر شریعت خامس بہار واڑیسہ کو دیکھا ہے، علم وفضل میں یکتائے روزگار اور وسعت مطالعہ واستحضار علمی میں بے نظیر تھے، ان کی پوری تعلیم اسی بہار میں مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں ہوئی، جب حضرت مولانا عبدالشکور آہؔ مظفر پوریؒ (حقیر کے جد اکبر) جیسے عباقرۂ روزگار وہاں تدریسی خدمات انجام دیتے تھے، مولانا ان کے خادم خاص تھے اور سفر وحضر میں ساتھ رہتے تھے، ان کی علمی گفتگو سے اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ مولانا نے دیوبند کا منہ نہیں دیکھا ہے۔

تاریخ کا یہ تسلسل بعد کے ادوار میں بھی جاری رہا لیکن ہندوستان سے اسلامی حکومت کے سقوط کے بعد بہار کی مرکزیت بھی جاتی رہی، افراد پیدا ہوتے رہے، لیکن خود بہار کو براہ راست کم ہی لوگوں سے فائدہ ملا، زیادہ تر لوگوں نے باہر کی دنیا کو اپنا میدان عمل بنایا اور ان کے ذریعہ جو بھی علمی مراکز قائم ہوئے وہ اسی علاقہ کی طرف منسوب ہوئے۔

مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ گو بہار کے نہیں تھی مگر اس معاملے میں ان کی حساسیت علماء بہار سے کم نہیں تھی، وہ چاہتے تھے کہ بہار کے فضلاء خود بہار کو مرکز عمل بنائیں، اور ان کے ذریعہ بہار میں خوش گوار تبدیلیاں پیدا ہوں، مگر لمبے عرصے کے توقف کی وجہ سے یہاں کے عام لوگوں میں ایسا جمود پیدا ہو چکا ہے کہ ان کی حالت کو دیکھ کر دل روتا ہے، جگر پارہ ہوتا ہے، آنکھیں خون کے آنسو بہاتی ہیں، کبھی ڈر لگتا ہے کہ شاید کوئی معجزہ ہی ان کی حالت کو بدل سکے، ...... بہر حال اہل درد اپنے افسانے جاری رکھے ہوئے ہیں اور یہ داستانیں انشاء اللہ اس وقت تک جاری رہیں گی جب تک کہ جسم و جان میں آخری قطرۂ لہو بھی باقی ہے۔

علمی اختلاف و اتفاق

☆ مولانا کی وسیع النظری کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ باوجود اس علم و فضل کے قبول حق کے باب میں کافی فراخ دل تھے، اپنے کئی معاصرین سے ان کو علمی اختلاف تھا، مگر اس کی بنیاد ان کے خلوص پر تھی، وہ کسی بات کو دلائل کی بنا پر صحیح یا غلط سمجھتے تھے، کسی دباؤ یا تعلق کی بنا پر نہیں، جس بات کو وہ غلط سمجھتے تھے، خواہ وہ کتنی ہی بڑی شخصیت کی طرف سے پیش کی جائے، یا ان کی کوئی محبوب ترین شخصیت بھی اس کی قائل ہو وہ قبول نہیں کر سکتے تھے، بلکہ برملا اس سے اختلاف کرتے تھے، اس معاملے میں ان کے یہاں مصلحت کا کوئی خانہ نہیں تھا، میرے سامنے اس کی کئی مثالیں ہیں ، میں ان میں سے ایک دو مثال پیش کرتا ہوں:

☆ عنین (نامرد) کا ایک مقدمہ دار القضاء امارت شرعیہ پٹنہ میں پیش ہوا، دار القضاء نے جو فیصلہ کیا دار العلوم دیوبند نے بھی اس کی توثیق کی، مگر مولانا کو ذاتی طور پر کچھ ایسے حقائق کا علم ہوا جس کی وجہ سے انہوں نے اس فیصلہ سے اختلاف کیا، اور پوری ایک کتاب اس کے خلاف لکھ ڈالی، جو ''نعیم اختر'' ان کے تاریخی نام سے شائع ہوئی،

☆ اسی طرح انشورنس کے مسئلے پر مولانا کا اختلاف کافی مشہور ہوا، یہ فیصلہ پہلے مجلس تحقیقات شرعیہ لکھنؤ نے کیا تھا، اس کی تائید بعد میں دار العلوم دیوبند کے مفتیان اور اساتذۂ کرام نے کی، سب سے آخر میں اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے اس فیصلہ کی توثیق و تصویب کی، ...... مولانا کو اس سے اختلاف تھا، انہوں نے برملا اس کا اظہار کیا، الماٰثر کے جس کے وہ ایڈیٹر تھے، کئی شماروں میں اس تعلق سے مضامین شائع کئے، ......

ایک بار اسی موضوع پر میرا ایک تحقیقی مضمون ماہنامہ حسامی حیدرآباد میں شائع ہوا، جس کا میں ایڈیٹر تھا

، مضمون میں مسئلہ کا علمی تجزیہ پیش کیا گیا تھا، کسی رجحان کی وکالت مقصود نہیں تھی ......، المآثر کے صفحات پر مولانا نے اس کا جواب شائع کیا، ......

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جس بات کو مولانا حق سمجھتے تھے اس کے اظہار میں ان کو کوئی تامل نہیں ہوتا تھا، وہ ایک بے باک اور بے لوث عالم دین تھے، مولانا کا ردعمل خواہ کتنے ہی سخت لب ولہجہ میں آیا ہو وہ ان کے اخلاص پر مبنی ہوتا تھا، اس میں کسی تعصب وتنگ نظری یا جانبداری کو دخل نہیں تھا،

میں مولانا کا شاگرد تھا، بہت سے دقیق علمی مسائل میں ان سے رجوع کرتا تھا، لیکن اگر کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آتی تو وہ اس کو منوانے پر اصرار بھی نہیں کرتے تھے، وہ دلیلوں سے بات ماننے کے قائل تھے، زبردستی نہیں، میرے سامنے اس کے کئی شواہد ہیں، تفصیل کا موقعہ نہیں صرف ایک دو چیز بطور مثال پیش کرتا ہوں:

پیر طریق کی موجودگی میں دوسرے پیر کی طرف رجوع

تصوف کے مسائل میں ایک اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی شیخ سے بیعت ہو جائے اور کچھ عرصہ گذر جانے کے باوجود اسے خاطر خواہ فائدہ کا احساس نہ ہو تو کیا شیخ کی حیات میں اس کی اجازت ورضا کے بغیر دوسرے شیخ سے تجدید بیعت کر سکتا ہے؟

اس معاملہ میں مولانا کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ تجدید بیعت کر سکتا ہے، بیعت کرنے سے بیعت لازم نہیں ہوتی بلکہ اصل مقصود فائدہ ہے، فائدہ محسوس نہ ہو تو دوسرے شیخ سے بیعت کر سکتا ہے، ......مولانا نے اپنے اس نقطۂ نظر کا اظہار اپنے مضمون ''تصوف ایک تعارف'' میں کیا ہے، جو پہلی بار رسالہ دارالعلوم دیوبند کے الاحسان نمبر میں شائع ہوا، بعد میں اس کو الگ کتابی صورت میں بھی چھاپ دیا گیا ہے، میں اسی الاحسان نمبر سے مولانا کی عبارت نقل کرتا ہوں:

''اگر کوئی شخص ایک شیخ کی خدمت میں خوش اعتقادی کے ساتھ ایک معتد بہ مدت تک رہے، مگر اس کی صحبت میں کچھ تاثیر نہ پائے تو دوسری جگہ اپنا مقصود تلاش کرے، کیونکہ مقصود خدا تعالیٰ ہے نہ کہ شیخ، لیکن شیخ اول سے بد اعتقاد نہ ہو، ممکن ہے کہ وہ کامل ومکمل ہو مگر اس کا حصہ وہاں نہ تھا، ......البتہ بلا ضرورت محض ہوسناکی سے کئی کئی جگہ بیعت کرنا بہت برا ہے، اس سے بیعت کی برکت جاتی رہتی ہے، اور شیخ کا قلب مکدر ہو جاتا ہے اور نسبت قطع ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے اور ہرجائی مشہور ہو جاتا ہے'' (رسالہ

دارالعلوم الاحسان نمبر اپریل تا جون ۱۹۹۳ء، ص ۳۹)

اسی الاحسان نمبر میں میرا بھی ایک مضمون ”صوفیت ایک تعارف“ کے عنوان سے شائع ہوا تھا، ...... میں نے اس تعلق سے مولانا کو خط لکھا، مولانا نے جواب دیا مگر کئی بار کی مراسلت کے بعد بھی بات میری سمجھ میں نہیں آئی، مولانا نے بھی اپنے خطوط میں زیادہ تفصیل سے کام نہیں لیا، اور دلائل کے بارے میں مجھ پر ذمہ داری ڈال دی کہ دلائل خود تلاش کرلو، ...... اس طرح مولانا اپنے نظریہ پر قائم رہے اور مجھے علم وتحقیق کے حوالہ کردیا، اور اپنا نظریہ مجھ پر مسلط کرنے کی کوشش نہی کی ...... میری رائے اخیر تک یہ رہی اور آج بھی میری یہی رائے ہے کہ انسان ارادت قائم کرنے میں جلدی نہ کرے، بلکہ شیخ کامل کی تلاش وجستجو میں وقت صرف کرے اور جب کوئی شخص ہر طرح اس کے عقیدہ ونظریہ اور شریعت کی کسوٹی پر کھرا اترے تو اس سے بیعت ہوجائے، حضرت مجدد صاحبؒ نے شیخ کامل کی تلاش پر اپنے مکتوبات میں بہت زور دیا ہے، اس کا مطلب ہے کہ مرد متقی کی تلاش پہلے ہونی چاہئے، بیعت ہونے کے بعد اس کے زہد وتقویٰ کو اپنے معیار پر نہیں تولنا چاہئے اور نہ ظاہری فائدہ اس باب میں کوئی معیار ہے، اس لئے کہ کبھی فوری فائدہ محسوس نہیں ہوتا یا فائدہ ہوتا ہے لیکن بسا اوقات طالب کو اس کا احساس نہیں ہوتا، اس لئے شروع کی بے کیفی، اضمحلال یا نفع کے عدم احساس سے انسان کو بددل نہیں ہونا چاہئے، ......

بہر حال یہ کوئی شرعی مسئلہ تو ہے نہیں کہ قرآن وحدیث میں اس کا ماٴخذ تلاش کیا جائے، یہ طریقت کا مسئلہ ہے، صوفیا کی کتابوں سے اس میں رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے، میرا یہ خیال لفظاً یا معناً متعدد صوفیاء طریق کے یہاں موجود ہے، مثلاً متقدمین صوفیا میں حضرت مخدوم شرف الدین یحیٰ منیریؒ اونچے درجے کے مشائخ طریق بلکہ مجددین طریق میں گذرے ہیں، ان کے مکاتیب تصوف میں سند کا درجہ رکھتے ہیں، ان کے ایک طویل مکتوب کا یہ اقتباس اس معاملے میں کافی صریح اور چشم کشا ہے،:

”لیکن چوں با پیرے صحبت کرد بے اجازت وے از آنجا نرود و از صحبت وے جدا نہ گردد، ایں نگاہ دارد و بر جملہ از غیرت پیراں احتراز باید گرد، اگر بے اجازت ایشاں یا بر طریق بطلان از پیر اول نزد پیر دیگر شود روا نباشد ہر کہ چنیں کند مرتد طریق باشد (مکتوب پنجم در طلب پیر والحاح در دعاء وسوال)

”(ترجمہ) بہر کیف مسئلہ یہ ہے کہ جب کسی پیر کی صحبت اختیار کرلی، تو بغیر اجازت اس کی صحبت سے الگ نہیں ہوسکتا اور دوسرے پیر کی طرف رجوع نہیں کرسکتا، اس امر کی سخت نگہداشت رکھنی چاہئے،

اور پیروں کی غیرت سے بچنا چاہئے، کیونکہ اگر بغیر اجازت یا بطریق بطلان اپنے پیر کو چھوڑ کر مرید دوسرے پیر کی طرف رجوع کرے گا تو وہ مرتد طریقت ہوگا،

(مکتوبات صدی مع ترجمہ حضرت سید شاہ نجم الدین فردوسی ص ۴۷ ناشر بیت الشرف خانقاہ بہار شریف ۱۹۷۳ء)

رسالہ المجیب پھلواری شریف میں حضرت مولانا شاہ علی سجاد نعمتی پھلوارویؒ کا ایک فارسی مکتوب جناب مولوی حکیم سید محمد یوسف پھلواروی کے ترجمہ کے ساتھ شائع ہوا ہے، اس میں بھی یہی مضمون تفہیم کے انداز میں آیا ہے

''بہر کیف وہر قدر کہ ممکن باشد بر معمولات مستقیم باشند واز توقف حصول بے دل نشوند انشاءاللہ ظہور مقصود خواہند یافت، امیدواراں ماہہا وسالہا بر در کافراں وعملہ رو برائے روزگار تگ ودو میکنند وسودے نمی بخشد اگر در بارگاہ جہاں آفریں بے نیاز در برآمد کار توقف رونمود جائے بے دلی نیست، ثمرۂ پریشانی دنیا بجز خسراں ونقصان نیست، وحیرانی وپریشانی در راہ خدا دریں جہاں ودرآں جہاں ثمرہ می دہد۔

''(ترجمہ) جس طرح اور جس قدر بھی ممکن ہو معمولات پر قائم رہیں، حصول مراد میں توقف کی وجہ سے بے دل نہ ہوں انشاءاللہ نفع ہوگا اور مقصود حاصل ہوگا، امیدوار مہینوں اور سالہا سال کافروں اور ان کے عملوں کے دروازے پر دوڑ دھوپ کرتے ہیں اور کوئی فائدہ نہیں ہوتا اگر جہاں آفریں بے نیاز کی بارگاہ کے دروازے پر حصول مقصود میں توقف رونما ہو تو بے دلی کی کوئی وجہ نہیں ہے، دنیاوی پریشانی کا ثمرہ نقصان اور گھاٹے کے سوا کچھ نہیں لیکن خدا کی راہ میں حیرانی اور پریشانی دونوں جہان میں نفع بخش ہے (رسالہ المجیب پھلواری شریف پٹنہ ص ۳۴ شمارہ ۱ ج ۱۱ ماہ رمضان ۱۳۸۹ھ مطابق نومبر ۱۹۶۹ء)

دوسرے صوفیاء کے یہاں بھی یہ مضمون آیا ہے تحقیق پر بہت سے حوالے جمع کئے جا سکتے ہیں،

بہر حال مولانا کو کسی بات کا قائل کرنا آسان نہیں تھا لیکن ایسا بھی نہ تھا کہ حق واضح ہونے کے بعد بھی وہ اپنی رائے پر خواہ مخواہ قائم رہے ہوں، بلکہ قبول حق کے لئے بھی وہ بہت فراخ دل واقع ہوئے تھے، اپنے ذاتی تجربات سے اس کی ایک مثال پیش کرتا ہوں:

قبول حق میں فراخ دل

غالبًا دارالعلوم دیوبند میں میرا ہفتم عربی کا سال تھا، حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی معرکۃ الآراء کتاب ’’تحذیر الناس‘‘ میرے مطالعہ میں آئی، حضرت نانا توی نے ختم نبوت کی جو دل نشیں تشریح فرمائی ہے، مجھے بہت پسند آئی، ابتدا میں مولانا کو بکثرت اپنی زیر مطالعہ کتابوں کا حاصل مطالعہ بھی لکھ کر میں بھیجا کرتا تھا اور مولانا اس کی تصویب وتصحیح فرمایا کرتے تھے، میں نے تحذیر الناس کی روشنی میں اپنی کچھ گذارشات مولانا کی خدمت میں بھیجیں، اس میں ایک مسئلہ اشیاء کی صفات ذاتیہ اور عرضیہ کا تھا، میں نے لکھا کہ اشیاء کی صفات ذاتیہ کبھی زائل نہیں ہوتیں اور نہ ان کو لانے کے لئے کسی خارجی تدبیر یا عرض عارض کی ضرورت ہوتی ہے، البتہ صفات عرضیہ زائل ہوسکتی ہیں، اسی طرح ان کو لانے کے لئے بھی کسی تدبیر کی ضرورت پڑتی ہے، میں نے پانی کی مثال دی کہ اس کی صفات ذاتیہ میں رقت وسیلان کے علاوہ برودت بھی ہے، وہ اس سے کبھی زائل نہیں ہوسکتی، عام طور پر کتب فقہیہ میں پانی کی صفات ذاتیہ میں صرف رقت وسیلان کا ذکر کیا گیا ہے، برودت کا ذکر نہیں آیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ فقہاء نے یہ بات ازالۂ نجاست کے ضمن میں لکھی ہے اور اس میں برودت وحرارت سے فرق نہیں پڑتا، بلکہ رقت وسیلان سے فرق پڑتا ہے، فقہاء حقائق اشیاء بیان کرنے کے لئے نہیں بیٹھے ہیں بلکہ وہ اغراض ومقاصد کو ہدف بناتے ہیں...... بہر حال مولانا کو میرا یہ خط ملا تو پہلی فرصت میں اس کا جواب دیا اور میری اس بات پر نکیر بھی فرمائی، مولانا نے تحریر کیا کہ برودت پانی کی صفات ذاتیہ میں نہیں ہے، اس پر تم غور کرو...... اتفاق سے حضرت نانوتویؒ ہی کی ایک کتاب میں مجھے یہ بحث مل گئی اور میں نے اس کو مستدل بنا کر برودت کے صفت ذاتی ہونے پر اصرار کیا، میں نے عرض کیا کہ برودت پانی سے کبھی زائل نہیں ہوتی، انتہائی گرم پانی میں بھی برودت باقی رہتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر جلتی ہوئی آگ پر کھولتا ہوا پانی ڈال دیں تو آگ بجھ جاتی ہے، اگر برودت زائل ہوگئی ہوتی اور حرارت اصلیہ پیدا ہوچکی ہوتی تو اس سے آگ کی حرارت دوچند ہونی چاہئے، اس لئے کہ حرارت حرارت سے بڑھتی ہے، ختم نہیں ہوتی، نیز حرارت کو لانے کے لئے تدبیر کرنی پڑتی ہے، زائل کرنے کے لئے نہیں، پانی کو چھوڑ دیجئے خود بخود اس کی حرارت ختم ہوجائے گی اور برودت اصلیہ ظاہر ہوجائے گی، برودت کو واپس لانے کے لئے کسی عمل کی حاجت نہیں ہے، یہ واضح دلیل ہے کہ برودت پانی کی صفات اصلیہ میں سے ہے۔

مولانا کو میری بات میں وزن محسوس ہوا اور اس کو قبول کیا اور لکھا کہ میرے خط سے اس حصہ کو قلمزد کردو ،...... یہ واقعہ اس بات کی دلیل ہے کہ مولانا قبول حق کے باب میں تنگ نظر نہیں تھے، وہ بڑے اور معاصرین تو کجا اپنے چھوٹوں کی بات کا بھی لحاظ کرتے تھے اور جب بھی انہوں نے اصرار کیا تو حق سمجھ کر کیا، تعند وتعصب کی بنا پر نہیں، اگر اس بات میں وہ خطا پر بھی ہوں تو ایک اجر کے بہر حال مستحق ہیں۔

مولانا سے میری مراسلت

مراسلت کا ذکر آیا ہے تو کچھ اپنی مراسلت کے احوال بھی بیان کردوں، علمی مراسلت کا شوق مجھے غازی پور کی طالب علمی کے زمانہ میں پیدا ہوا، میں عربی دوم کا طالب علم تھا، ایک علمی مسئلہ پر میرے گاؤں کے ایک بزرگ صاحب علم جناب مولانا عبدالصمد صاحب مرحوم جو اس زمانہ میں مدرسہ ریاض العلوم گورینی ضلع جونپور یوپی میں مدرس تھے، سے میری مراسلت ہوئی، طالب علمی کا وقت، میرا مطالعہ ہی کیا تھا، مگر ایک ردعمل کے نتیجہ میں اس مراسلت کا سلسلہ شروع ہوا، اس کے بعض نمونے میرے پاس آج بھی موجود ہیں، ان کو پڑھتا ہوں تو بے اختیار ہنسی چھوٹ جاتی ہے، مواد سے زیادہ الفاظ کا کھیل تھا، اور بزرگانہ حدود کی بھی اس میں رعایت نہیں تھی، جیسے وہ کسی جذبۂ انتقام کے تحت مناظرانہ انداز میں لکھی جارہی ہوں، انہی دنوں غالباً ہم لوگوں نے مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ کی عنایت سے حضرت مولانا سید طاہر حسین گیاوی دامت برکاتہم کے مناظرہ جھریا (اڑیسہ) کی کیسٹ سنی تھی، لگتا ہے کہ ان خطوط پر اس کا رنگ آگیا تھا اور زبان خالص پرانے دور کی عربی آمیز استعمال کی گئی تھی، ...... بزرگانہ حدود کی رعایت ملحوظ نہ رہنے کی بنا پر اس جرم کی شکایت انہوں نے اپنے مدرسہ کے بزرگ استاذ حدیث حضرت مولانا افضال الحق جوہر قاسمیؒ جو ہمارے مولانا کے بھی استاذ تھے، سے کی، مولانا افضال صاحبؒ نے ایک خط مولانا اعجاز احمد صاحبؒ کے پاس فرد جرم عائد کرکے بھیج دی، اس طرح مولانا کو میری مراسلت کا پتہ چلا، مولانا نے مجھے بلا کر اس تعلق سے استفسار کیا، جب میں نے پوری صورت حال بتائی، تو کافی دیر تک محظوظ ہوئے اور یہی عربیت آمیز مکاتبت اگلے تعلیمی سال (عربی سوم) میں میرے نائب معلن انجمن نامزد کئے جانے کا سبب بن گیا، بہر حال اس کے بعد غازی پور میں پھر دوبارہ کسی مکاتبت کا موقعہ نہیں ملا،......

دیوبند پہونچا، مولانا سے دوری ہوئی، کتابوں کا مطالعہ بڑھا، کچھ الجھنیں پیدا ہوئیں تو پھر مولانا سے

مراسلت کا سلسلہ شروع ہوا، میں خواہ مخواہ خط لکھنے کا قائل نہیں تھا، اپنی خبر خیریت کو میں اتنی اہمیت نہیں دیتا تھا کہ اس کیلئے استاذ محترم کے قیمتی اوقات کا کچھ حصہ ضائع کیا جائے، میرا خیال تھا کہ استاذ کے پاس جائیں یا ان سے مراسلت کریں تو کسی علمی مسئلہ کی تحقیق وتشریح کے لئے جائیں، اسی لئے میری مکاتبت چند اساتذہ تک محدود رہی، مجھے بعد میں اپنی اس کمی کا احساس ہوا لیکن وقت گذر چکا تھا،......

بہرکیف مختلف علمی مسائل پر مولانا سے مراسلت کا سلسلہ عربی ہفتم کے سال شروع ہوا، دارالعلوم دیوبند کا ماحول میرے لئے نیا تھا اور اساتذۂ دارالعلوم سے تعارف نہ ہونے کی بنا پر ان کی خدمت میں حاضری اور اپنی علمی مشکلات کی گرہ کشائی کی درخواست کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی، اس لئے مولانا سے تعلق اور ان کی دریا دلی کو دیکھتے ہوئے آسان یہی محسوس ہوتا کہ مولانا سے ہی مراجعت کی جائے،...... نیز یہ احساس بھی ہمہ وقت دامن گیر رہتا تھا، کہ مولانا کی نگاہ سے اوجھل ہونے کے بعد ان کو ہمارے علمی اشتغال کا پتہ چلتا رہے، اور ان سے اظہار تعلق بھی رہے، اس لئے کہ ہماری علمی ترقی سے جو خوشی مولانا کو ہوسکتی تھی وہ اس وقت دنیا میں شاید کسی کو نہ ہوسکتی تھی، انہوں نے ہمیں اپنے بچوں کی طرح پالا تھا، اور دیوبند کے وسیع علمی ماحول میں اس لئے بھیجا تھا کہ علم وفن کا جو تخم انہوں نے ہمارے قلب ودماغ کی زمین پر بویا ہے وہ کس حد تک برگ وبار لاتا ہے؟ اور ہمارے خرمن جستجو کو جس خون جگر سے انہوں نے سینچا ہے، دیوبند کی آب وہوا میں وہ کس حد تک بہار آشنا ہوتا ہے؟ اس لئے مولانا کو ہمیشہ ہمارے خطوط اور علمی روداد سفر کا انتظار رہتا تھا، کبھی دیر ہوتی تو اس کا شکوہ فرماتے، مولانا اس باب میں بہت حساس تھے، اور شدت تعلق کی بنا پر کبھی بہت چھوٹی چھوٹی باتوں پر گرفت فرماتے تھے، مولانا خود فرماتے تھے کہ میں محبت کا مریض ہوں، اس لئے محبت کا گھاؤ ان کے لئے بہت گہرا ہوتا تھا، ہمیں اس وقت مولانا کے اس درد وغم کا پورا احساس نہ تھا، لیکن بعد میں جب ہم نے عملی زندگی میں قدم رکھا اور کبھی اسی قسم کے صبر آزما حالات سے دوچار ہونا پڑا تو مولانا کا رنج وغم یاد آیا اور پورا وجود ندامت سے عرق عرق ہوگیا کہ ہم نے اپنی بے حسی سے مولانا کو کتنی تکلیفیں پہونچائیں، پھر مولانا کے وہ جملے یاد آئے جو انہوں نے انتہائی رنجیدگی کے عالم میں کئی بار مجھے لکھے تھے، لیکن میں اپنی نادانی یا ناپختگی کی وجہ سے ان کے اندر چھپے ہوئے اس کرب کو نہ جان سکا اور ناز پروردہ صاحبزادوں کی طرح ان کے احوال دل سے غافل رہا، اللہ پاک مجھ پر رحم فرمائے اور مولانا کی روح پر بھی رحمتوں کی بارش فرمائے، ان کو سکون ابدی نصیب فرمائے آمین، سوچتا ہوں، کسی نے

کسی سے اسی عالم میں یہ شعر کہا ہوگا:

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کردے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

میری بعض نادانیوں سے مولانا کو تکلیف بھی پہونچی، لیکن اس کے باوجود وہ مجھ سے بے پناہ محبت اور حسن ظن رکھتے تھے، ان کو مجھ سے قطع تعلق گوارا نہیں تھا اور نہ میرا علمی وفکری معیار فروتر دیکھنا چاہتے تھے، پتہ نہیں میں مولانا کی امیدوں پر اتر سکا یا نہیں لیکن بہرحال اپنے آخری دور میں وہ اپنے جذبۂ شفقت ومحبت سے مجبور ہوکر جیسا بھی میں تھا انہوں نے مجھے گلے لگالیا، مجھے کئی علمی مسائل پر مولانا سے اختلاف تھا اور مولانا نے پوری کوشش فرمائی کہ وہ اپنے نقطۂ نظر سے مجھے مطمئن فرمائیں، لیکن اپنی علمی بے بضاعتی کی وجہ سے مجھے شرح صدر نہیں ہوسکا، مولانا کچھ جھنجھلائے بھی، لیکن میری روش میں فرق نہیں آیا، مجبورا مجھے برباد ہونے سے بچانے کے لئے مولانا ہی محبت سے ہار گئے اور مولانا کے سامنے میری ایک نیازمندی نے میرا سارا قصور دھوڈالا، آخر مولانا فرشتۂ محبت تھے، ان کی کتاب زندگی میں وصل کے علاوہ فصل کا کوئی عنوان ہی نہیں تھا، (الا یہ کہ دینی الحاد وزندقہ کا معاملہ ہو)

دیوبند کے پانچ سالہ قیام کے دوران مولانا سے میری جو مراسلت ہوئی اس کا بڑا حصہ ضائع ہوگیا، وہ اس طرح کہ دارالعلوم کی معین مدرسی کے اختتام پر جب میں پورے سازوسامان کے ساتھ اپنے گھر واپس آرہا تھا، تو سامان کا وزن زیادہ ہونے کی بنا پر میں نے اپنی کتابوں اور کاغذات کا ایک بڑا کارٹون ریلوے ڈاک کے حوالہ کردیا، جو مہینوں نہیں ملا، سعی بسیار کے بعد مجھے سمستی پور ریلوے اسٹیشن کے پارسل گودام میں وہ کارٹون کھلی ہوئی حالت میں ملا، دیکھا تو اس کا سب کچھ نکل چکا ہے اور کچرا بھرا پڑا ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون، ...... ہندوستان کی ریلوے ڈاک سے اس دن جو وحشت قائم ہوئی آج تک ختم نہ ہوسکی، ...... مولانا کے خطوط بھی ریلوے ڈاک کے اسی مقبرہ میں دفن ہوگئے، آج جب مولانا نہیں ہیں تو اس درد میں اور بھی اضافہ ہوگیا ہے، ...... دو چار خطوط باقی رہ گئے ہیں، اپنے سینہ کے داغوں کو تازہ کرنا ہوتا ہے تو انہی کو نکال کر دیر تک الٹتا پلٹتا رہتا ہوں اور تھوڑی دیر کے لئے آج کی مصروف دنیا سے نکل کر اپنے ماضی کے بچپن میں پہونچ جاتا ہوں، مولانا اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے:

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

آج مولانا ہمارے درمیان نہیں ہیں، تو ان کی ایک ایک بات یاد آ رہی ہے، ایک بار جب میں مدرسہ دینیہ کا طالب علم تھا، میرے والد ماجد کو مولانا نے تحریر فرمایا:

’’ماشاء اللہ اختر سلمہٗ مدرسہ کا سب سے ممتاز طالب علم ہے، اللہ تعالیٰ آپ کی اور میری آرزو پوری کرے کہ وہ ایک جامع علم وعمل عالم بنے اور وہ خود بھی اپنے علم سے نفع اندوز ہو اور دوسرے بھی اس سے فیضیاب ہوں‘‘ (اعجاز احمد اعظمی مکتوب ۲۷/ جمادی الاخریٰ ۱۴۰۴ھ)

میرے ایک خط کے جواب میں تحریر فرمایا:

’’واپسی پر تمہارا خط ملا، پڑھا اور دل میں غیر معمولی مسرت محسوس ہوئی، بحمد اللہ میری آرزوؤں کی تکمیل حق تعالیٰ تمہاری ذات سے کرا رہے ہیں، میں نے اول بھی یہی چاہا اور آخر بھی یہی تمنا ہے کہ میرے دوستوں کی زندگی خدمت دین کے لئے وقف رہے، بحمد اللہ تمہارے اندر استعداد ہے اور حق تعالیٰ نے مواقع بھی عنایت فرمائے ہیں،...... میں دن رات تمہارے لئے دعا کرتا ہوں کہ حق تعالیٰ حیاۃ طیبہ عنایت فرمائیں، علم وعمل کی حرص نصیب فرمائیں، اخلاص ومحبت ارزانی فرمائیں، قبولیت ومحبوبیت سے نوازیں، دنیا وآخرت میں سرخرو وشادکام بنائیں۔

ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد (مکتوب یکم جمادی الاولیٰ ۱۴۰۹ھ)

قصہ میری پہلی تالیف کا

☆ قیام دیوبند کے آخری سالوں میں میری پہلی کتاب ’’منصب صحابہ‘‘ شائع ہوئی اور اس کی اشاعت بھی ایک ڈرامائی صورت اختیار کر گئی، اس کتاب کی اشاعت نہ ہوتی تو شاید مجھ سے کوئی ناراض نہ ہوتا، صرف ناشر کتاب جواب سعودی میں رہتے ہیں، مجھ سے ناراض ہو جاتے، اس لئے کہ کتاب کی شاعت کا معاملہ ان سے مکمل ہو چکا تھا،...... لیکن کتاب کی اشاعت سے جماعت اسلامی کے احباب کو کوئی غصہ آیا یا نہیں، اس لئے کہ اس مسئلہ کا براہ راست تعلق انہی سے تھا؟ اس کا پتہ نہیں چل سکا،...... لیکن میرے اپنے ہی کئی بزرگ مجھ سے ضرور ناراض ہو گئے اور

ہر ایک کی ناراضگی محبت واخلاص ہی کی وجہ سے تھی اور سب کے پیش نظر میری ہی فلاح وترقی تھی ،.......

واقعہ یہ ہوا کہ کتابت کا مرحلہ مکمل ہونے کے بعد ناشر کتاب نے اپنے طور پر حضرت اقدس ، محدث اکبر ، جامع المعقول والمنقول حضرت علامہ محمد حسین بہاریؒ محدث دارالعلوم دیوبند اور فقیہ ملت ، مفتی کبیر حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحیؒ مفتی دارالعلوم دیوبند سے کتاب دکھلا کر تقریظات لکھوالیں ، علامہ بہاریؒ تقریظ کے معاملہ میں سخت مشہور تھے ، لیکن از راہ عنایت مولانا مرحوم نے بھی تقریظ لکھی اور عادت کے خلاف زوردار لکھی ، ان دو بزرگوں کی تقریظات کے حصول میں ہمارے ناشر کتاب صاحب کی سعی ومحنت کا براہ راست دخل تھا ، ان دونوں بزرگوں کی تحریرات حاصل ہونے کے بعد ناشر صاحب بعجلت اس کتاب کو پریس کے حوالہ کرنا چاہتے تھے اور اس میں کسی تاخیر کے روادار نہ تھے ، لیکن میں نے اصرار کے ساتھ ایک دو بزرگوں سے اور ملنے کا فیصلہ کیا ، چنانچہ اسی ضمن میں میں نے موجودہ صدر المدرسین وشیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالنپوری دامت برکاتہم اور معروف ادیب ومحدث حضرت مولانا ریاست علی بجنوری دامت برکاتہم سے ملاقات کی ، حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم کو اولاً اس رسالہ کے بنیادی تصورات ومضمرات سے اختلاف ہوا ، لیکن پھر جلد ہی ان کو شرح صدر ہوگیا اور اس پر ایک زوردار علمی مبسوط مقدمہ لکھا ، حضرت مولانا ریاست علی صاحب دامت برکاتہم نے اس کو حلقۂ دیوبند کی طرف سے مسئلہ معیار حق کی پہلی مستند تشریح قرار دیا اور اسی لئے ان دونوں بزرگوں کی متفقہ رائے ہوئی کہ یہ علماء دیوبند کا ایک نظریاتی مسئلہ ہے ، جس کی اس کتاب میں معتبر انداز میں وکالت کی گئی ہے ، اس لئے اسکی اشاعت دارالعلوم دیوبند کی شیخ الہند اکیڈمی کی طرف سے کی جانی چاہئے ،...... میرے لئے یہ ایک انتہائی سعادت کا مقام تھا ، جس کا میں تصور بھی نہیں کرسکتا تھا ،...... لیکن یہ بات جب ہمارے ناشر صاحب کو معلوم ہوئی تو گویا ان کے پاؤں تلے زمین نکل گئی ، سخت چراغ پا ہوئے اور اس کو انہوں نے معاملہ کی خلاف ورزی اور بدعہدی قرار دیا......اور آخر وہ جنگ جیت گئے ...... انہوں نے ہمارے دونوں بزرگ حضرت علامہ بہاریؒ اور حضرت مفتی محمد ظفیر الدین صاحبؒ کو اعتماد میں لیکر کتاب کا مسودہ اپنے قبضہ میں لے لیا ، دیوبند کے در ودیوار پر اس کے اشتہاری پمفلٹ شائع کئے اور اس کے کچھ دنوں کے اندر ہی کتاب منظر عام پر آگئی ، اس طرح میری زندگی کی پہلی کتاب میرے آرزوؤں کے خون سے تیار ہوئی اور میری تمناؤں کے کھنڈرات پر میری شہرت کی پہلی عمارت تعمیر ہوئی ، اب میں نہ حضرت مفتی سعید صاحب پالنپوری کو

دکھانے کے لائق تھا اور نہ حضرت مولانا ریاست صاحب کو، جو اس وقت شیخ الہند اکیڈمی کے مختار کل (ڈائریکٹر) تھے ،......ایک مدت کے بعد اپنی کتاب لیکر ان دونوں بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہوا تو حضرت مولانا ریاست صاحب نے تو بزرگانہ تحمل سے کام لیا، لیکن حضرت مولانا مفتی سعید صاحب مجھ سے بہت محبت فرماتے تھے اور میرے بہتر مستقبل کے آرزومند تھے، مجھ پہ سخت ناراض ہوئے اور بہت زجر وتوبیخ فرمائی، ان کو اس خوبصورت موقعہ کے ضائع ہوجانے کا بہت افسوس تھا، افسوس تو مجھے بھی تھا، لیکن معاملہ پہلے طے ہو چکا تھا اس لئے از روئے شرع مجبور تھا،......

دوسری طرف میری دلی خواہش تھی کہ یہ کتاب چھپنے سے قبل مولانا اعجاز احمد صاحب کی خدمت میں پیش کروں، اس لئے کہ میرے سلیقۂ تحریر میں سب سے پہلا اور سب سے زیادہ حصہ انہی کا ہے، یہ قلم میرے ہاتھوں میں انہی کا پکڑایا ہوا ہے، اس لئے اپنی اس پہلی کتاب میں اپنے پہلے محسن کو میں کیسے فراموش کرسکتا تھا، یہ کتاب میری نہیں ان کی تھی، یہ اسی تخم اولین کا برگ وبار ہے جو مولانا نے غازی پور میں ڈالا تھا،...... مجھے احساس تھا کہ وہ اپنے اس نیازمند کی پہلی کتاب اور اپنی اس محنت کا پہلا پھل دیکھ کر اتنا خوش ہونگے جس کا میں تصور بھی نہیں کرسکتا تھا،......لیکن بدقسمتی سے ایسی ڈرامائی صورت پیدا ہوئی کہ اس کے لئے موقعہ نہیں نکل سکا، کتاب چھپنے کے بعد مارے شرم کے میں چھپتا رہا، نہ ملنے کی طاقت، نہ خط لکھنے کی یارا، میں نے خوف سے ایک عرصہ تک کتاب نہیں بھیجی کہ مولانا کو تکلیف ہوگی اور ان کو خدانخواستہ نظرانداز کئے جانے کا احساس ابھرے گا، اسی بیچ غازی پور کا میرا ایک ناگہانی سفر بھی پیش آیا ، جی چاہا کہ اپنے مرکز محبت کا سامنا کروں مگر میرے اندر اس کی ہمت نہیں تھی،......لیکن کب تک؟ ایک نہ ایک دن مولانا کو خبر ہونی ہی تھی......آخر ہوئی اور کچھ دوستوں کی کرم فرمائی بھی شامل رہی، مولانا نے اس پر انتہائی رنج کا اظہار فرمایا، اور اپنے ایک خط میں دل کا درد کھول کر رکھدیا، خوب زجر وتوبیخ فرمائی......اور پوری زندگی گذرگئی میں نے اپنا قصۂ عذر بھی بیان نہیں کیا اور نہ کبھی صفائی پیش کی، ایک مجرم کی طرح سب کچھ میں نے خاموشی کے ساتھ سن لیا، اس پس منظر میں مولانا کا یہ مکتوب رنج پڑھئے، جس کے حرف حرف سے محبت ٹپکتی ہے:

> ’’دوسری چیز جو میرے لئے باعث تکلیف بنی وہ یہ کہ تمہاری پہلی تالیف آئی، مگر تم نے مجھے اس کی ہوا بھی نہیں لگنے دی، بہت عرصہ کے بعد جبکہ وہ کتاب دوسرے ذرائع سے مجھے حاصل ہو چکی تھی، تب تم نے بھیجی، جبکہ میرے خیال میں تمہارے سلیقۂ تحریر وتقریر میں سب سے پہلا اور سب سے زیادہ

دخل میرا تھا، مجھے محسوس ہوا کہ تم مجھ سے دوری اختیار کر رہے ہو، اسی احساس نے الجھن پیدا کی اور یہ احساس اس وقت اور زیادہ ہوا، جب تم نے غازی پور، مئو اور جہانا گنج کا سفر کیا، اور اگر کوئی شخص لائق التفات نہیں تھا وہ میں تھا، تم سوچو کہ اگر میری جگہ تم ہوتے اور تمہارا کوئی عزیز ترین شاگرد جس کی تربیت و پرداخت میں تم نے اپنے ذہن و قلب کو مصروف رکھا ہو اور اس کے لئے خون جگر جلایا ہو، ایسی ہی بے التفاتی کر کے گذر جائے تو تم پر کیا گذرے گی، کیا یہ بات تمہارے سوچنے کی نہیں ہے‘‘ (مکتوب ۱۶/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۱ھ)

ظاہر ہے کہ مولانا کو جو بھی رنج پہونچا وہ صورت حال سے بے خبر ہونے کی بنا پر، میرے بعض بہی خواہوں نے اسے خوامخواہ ہوا دی جس کی خبر میرے والد ماجد کو بھی پہونچ گئی، مولانا کی رنجیدگی سے والد صاحب کو دکھ ہوا انہوں نے کسی واقفکار کے ذریعہ صورت حال سے باخبر کرایا اور اپنے طور پر ایک سفارشی خط بھی لکھا، مولانا نے والد صاحب دامت برکاتہم کے جواب میں تحریر فرمایا:

’’آپ کی یادآوری کو اپنی خوش بختی اور سعادت تصور کرتا ہوں، ...... عزیزم مولوی اختر امام عادل سلمہ کو ہرگز بھولا نہیں ہوں، بھلا ایسے عزیز دوست کو کون بھلا سکتا ہے، مگر عزیز موصوف سے کچھ نادانی ہوگئی، ان کے ہر خط کا میں نے جواب بھی دیا ہے، شاید میرا آخری خط انہیں نہیں ملا، یا ان کا کوئی ایک خط مجھے نہیں ملا، اسی میں مراسلت کا انقطاع ہوگیا، ان کے بعض کاموں کی وجہ سے مجھے کبیدگی ہوگئی تھی، میں نے اس پر تنبیہ بھی کی، ...... کل پرسوں ان کا خط آیا جس میں انہوں نے تواضع اور خاکساری کا حق ادا کر دیا ہے، طبیعت بہت متأثر ہوئی، اب بحمد اللہ کسی طرح کا تکدر باقی نہیں رہا، یہ پورا واقعہ میں نے اس لئے لکھدیا تا کہ آپ کو کسی طرح کا خلجان نہ رہے، امید ہے کہ میری طرف سے جس تساہل اور فراموشی کا آپ کو احساس ہوا اس سے درگذر فرمائیں‘‘

(مکتوب ۲۴/ جمادی الاخریٰ ۱۴۱۱ھ)

بہر حال میری تو کوئی لیاقت نہیں لیکن جو کچھ بھی الٹا سیدھا لکھنا پڑھنا آیا وہ سب مولانا ہی کی محنت اولین کا نتیجہ ہے، میں نے ہمیشہ مولانا کے سامنے سلسلۂ نیاز قائم رکھا، مولانا نے بھی ہمیشہ مجھے یہی احساس دلایا، ایک خط میں

تحریر فرمایا:

> ''اس کا تصور تک مت کرنا کہ تم اونچی کتابیں پڑھاتے ہو، مضامین لکھتے ہو، لمبی تقریر کرتے ہو، تو میرے سامنے کچھ بڑے ہو گئے ہو، اپنے کو میرے سامنے وہی بچہ سمجھو جو ۸۰ء میں تھا۔
>
> (مکتوب ۲/ رجب ۱۴۱۶ھ)

درمیان میں بعض نظری مسائل کولیکر مولانا کو مجھ سے کچھ اختلاف رہا، مجھ کو نہیں، اس لئے کہ میں نے کبھی ایک لفظ بھی مولانا کی ذات والاصفات یا ان کی کسی تحریر کے حوالہ سے لکھنے کی جرأت نہیں کی، ہمیشہ ادب میرے لئے مانع رہا، البتہ بعض مواقع پر مولانا نے حق استاذی ادا فرمایا اور میری تنبیہ کے لئے بعض چیزیں شائع فرمائیں، مجھے اس سے کبھی تکدر نہیں ہوا، علمی مسائل میں استاذ اور شاگرد کے مابین مکمل ہم آہنگی ضروری نہیں ہے اور نہ اس سے شاگردی کا رشتہ متاثر ہوتا ہے، ...... دینی شخصیات کے بارے میں بھی مطالعہ و تجربہ میں فرق ہو سکتا ہے اور اس کی وجہ سے اختلاف رائے بھی ممکن ہے، بہر حال مولانا نے انتہائی خلوص کے ساتھ بعض علمی نظریات کو انتہائی تصلب کے ساتھ اختیار فرمایا اور میری رائے بصد ادب و احترام ان سے الگ رہی اور عجب نہیں کہ مولانا کی رائے ہی درست ہو لیکن میرے لئے وہ نا قابل فہم رہی۔

ذوق مناظرہ

مولانا کو ابتداء میں مناظرہ سے بڑی دلچسپی تھی، جیسا کہ انہوں نے اپنی خودنوشت میں بھی اس کا اظہار کیا ہے، ہم لوگوں نے جس دور میں ان کو دیکھا ان پر تصوف و احسان کا غلبہ تھا اور زیادہ تر ان کی توجہ علمی، فنی اور تحقیقی امور کی طرف رہتی تھی، ذوق مناظرہ میں اضمحلال ضرور آیا تھا لیکن ختم نہیں ہوا تھا، البتہ اب اس کا رخ تقریر کے بجائے تحریر کی طرف ہو گیا تھا، اسی زمانہ میں انہوں نے مسئلہ عنین پر تردیدی علمی مقالہ لکھا، جو ''نعیم اختر'' کے فرضی نام سے شائع ہوا، ''بودم بے دال'' رازداں کے نام سے لکھا، ''ایک ذہنی طغیان کا احتساب'' کے نام سے مسئلہ ایصال ثواب پر اپنے نام سے ایک کتاب تحریر فرمائی وغیرہ، ......

مولانا ہم لوگوں میں بھی مناظرہ کا ذوق پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے، ایک بار اس کی تربیت دینے کے لئے باقاعدہ مجلس مناظرہ منعقد فرمائی جس میں تمام اساتذہ و ذمہ داران کے علاوہ کچھ معززین شہر نے بھی شرکت کی

،طلبہ کی دو ٹیم بنائی گئی، دیوبندی اور بریلوی، دیوبندیوں کے ترجمان مولوی انعام غازی پوری مقرر ہوئے اور بریلویوں کے ترجمان مفتی نسیم احمد مظفر پوری مرحوم بنے، میں عربی سوم میں تھا اور مفتی نسیم کا نائب تھا، مناظرہ زوردار اور دلچسپ رہا، تمام شرکاء نے اس کی داد دی، دارالعلوم دیوبند کو چھوڑ کر ہندوستانی مدارس میں یہ اپنی نوعیت کا منفرد مناظرہ تھا، ......

شاید مدرسہ دینیہ کی تاریخ میں اتنا خوبصورت دور پھر نہیں آیا، ......مولانا کا یہ رنگ ان کے بہت سے تلامذہ میں منتقل ہوا، مجھ پر بھی اس ذوق کا عرصہ تک غلبہ رہا اور تقریری و تحریری دونوں طرح کے مناظروں کا بارہا تجربہ ہوا،

میری طالب علمی کے مناظرہ کا ایک دلچسپ قصہ

اس موقعہ پر غازی پور کے عہد طالب علمی کا ایک اور مناظرہ صفحۂ ذہن پر ابھر رہا ہے، جو ہم نے کسی استاذ کی سرپرستی کے بغیر انجام دی تھی اور کامیاب رہے تھے، ......شہر میں کسی میلاد کے موقعہ پر ہمارے استاذ محترم حضرت مولانا مختار احمد خیرآبادی تقریر کے لئے مدعو تھے، اس میں شہر کے مشہور اور قدیم مدرسہ چشمۂ رحمت (جواب بریلوی مکتب فکر کا نمائندہ ہے) سے بھی ایک استاذ تقریر کے لئے بلائے گئے تھے، جمعرات کی شام تھی، مولانا مختار صاحب کی مناسبت سے ہم چند ساتھیوں کی بھی ایک جماعت میلاد سننے کے لئے وہاں پہونچ گئی، پہلے مولانا مختار صاحب کی تقریر ہوئی اور وہ رخصت ہوگئے پھر بریلوی مقرر کا نمبر آیا اس نے مولانا کی تقریر کا محاسبہ کر ڈالا اور ایک نفرت کا ماحول پیدا ہوگیا، صاحب خانہ کے رعب داب سے ہم لوگ وہاں کچھ نہ بول سکے، لیکن دوسرے دن میں نے چند ساتھیوں کے ساتھ چشمۂ رحمت پر دھاوا بول دیا، پہلے ہم نے مدرسہ کے باہر ایک چھوٹی سی مسجد میں پڑاؤ ڈالا اور وہاں سے مقرر موصوف کو مناظرہ کی دعوت پیش کر دی اور ایک چھوٹی سی تحریر بھیجی، لیکن انہوں نے غالبًا بچوں سے منہ لگانا مناسب نہیں سمجھا اور مدرسہ سے باہر آنے کو تیار نہ ہوئے، تو ہم لوگ ہمت کر کے خود ہی مدرسہ کے اندر پہونچ گئے اور وہاں موجود لوگوں سے کہا کہ کل کی میلاد میں آپ کے مولانا صاحب نے برسر مجلس ہمارے استاذ کی تردید و تضحیک کی ہے، اس لئے ہم ان سے اس موضوع پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں، وہ عوامی مجلس تھی اس لئے ہم خاموش رہے، لیکن آج اہل علم کے درمیان ہمیں ثابت کرنا ہے کہ حق پر کون ہے؟ آپ کے مولانا صاحب یا ہمارے استاذ صاحب؟ ......چشمۂ رحمت کے طلبہ اور اساتذہ نے ہماری چرب زبانی دیکھی تو ایک بھی ہمارے قریب نہیں آیا اور نہ وہ مقرر صاحب اپنے حجرہ سے برآمد ہوئے، ......تھوڑی دیر ہم لوگ وہاں ٹھہرے، پھر فتح مبین کے نعرے لگاتے ہوئے واپس مدرسہ دینیہ آ گئے، ہم

لوگ مغرب بعد والی تعلیم سے غیر حاضر رہے اور عشاء کی نماز کے بہت بعد واپس ہوئے، ہمارے ساتھ طلبہ کا جم غفیر تھا، مدرسہ میں تمام اساتذہ اور طلبہ کو کانوں کان خبر ہو چکی تھی، مدرسہ کے قریب پہونچے تو ہم لوگ خاموشی کے ساتھ مدرسہ میں داخل ہو گئے، لیکن ہمارے پہونچتے ہی سارا مدرسہ اکٹھا ہو گیا، مولانا مختار صاحب تو گویا منتظر ہی بیٹھے تھے، پہلی فرصت میں ہمیں طلب کیا اور خوب مٹھائیاں کھلائیں، ...... ہمارے اس مناظرہ کی یاد آج بھی اس مدرسہ کی چہار دیواری میں موجود ہے، ابھی چند ماہ قبل مدرسہ دینیہ حاضری کا موقعہ ملا تو مولانا مختار صاحب نے کئی بار اس واقعہ کا ذکر فرمایا۔

آج میں نے خواب کی تعبیر دیکھ لی......

قیام غازی پور کا ایک واقعہ میرے لئے نیک فال اور ناقابل فراموش ہے، جی چاہتا ہے اس کو ذکر کردوں، ایک موقعہ کی بات ہے، غالبًا کوئی تعلیمی دن تھا، بمبئی کے کوئی معزز مہمان اچانک وارد ہوئے، حضرت مولانا عزیز الحسن صدیقی مہتمم مدرسہ اور حضرت مولانا مشتاق احمد غازی پوری صدر المدرسین ان کو لیکر عصر کے بعد شوکت منزل پہونچ گئے، ان کو اپنے مدرسہ کا معائنہ کروانا تھا، مہتمم صاحب نے مولانا اعجاز صاحب سے کہا کہ مہمان محترم کے استقبال میں بعد نماز مغرب ایک استقبالیہ نشست ہونی چاہئے، جس میں کسی طالب علم کی تقریر بھی سنوائی جائے، ہفتہ کا درمیانی دن تھا کسی کو پوری تقریر یاد نہ تھی اور اچانک تقریر کرنے کی ہمت بھی نہ تھی، میری تلاش شروع ہوئی، میں اتفاق سے اپنے گاؤں کے کسی عزیز سے ملنے کے لئے ریلوے اسٹیشن گیا ہوا تھا، آدمی اسٹیشن چھوڑا گیا، اور آناً فاناً مجھے طلب کیا گیا، میں پہونچا تو جلسہ کی کاروائی شروع کی جارہی تھی، ایک استاذ نے آہستہ سے مجھ سے پوچھا کوئی تقریر یاد ہے؟ ابھی اسی مجلس میں کرنی ہے، میں نے کہا یاد تو نہیں ہے لیکن حضرت نانا تویؒ کی ایک کتاب اسی ہفتہ پڑھی ہے، اس کو اپنے لفظوں میں بیان کردوں گا، بہرحال میرا نام پکارا گیا، میں ہانپتا کانپتا ڈائس پر پہونچا اور برجستہ اور بے خوف تقریر کی، تقریر سے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ میں سوچ سمجھ کر بول رہا ہوں، تقریر رٹی ہوئی نہیں ہے، تقریر ختم ہوتے ہی شاباشیوں اور داد و تحسین کی آوازیں بلند ہوئیں، مہمان محترم بھی بہت متأثر دکھائی دیئے، مجھے خوب یاد ہے کہ حضرت مہتمم صاحب نے انتہائی خوشی اور سرمستی کے عالم میں یہ الفاظ اپنی تقریر میں کہے تھے کہ:

”میں نے اس مدرسہ کے تعلق سے جو حسین خواب دیکھے تھے آج میں نے ان کی تعبیر بھی دیکھ لی“

اور پورا مجمع صدائے سبحان اللہ سے گونج اٹھا، فالحمد للہ علیٰ ذلک۔

منوروا شریف کی آخری آمد

مولانا کو منوروا شریف اور میرے والد صاحب دامت برکاتہم سے ہمیشہ تعلق رہا، شروع میں آمد ورفت زیادہ تھی، ...... بعد میں کم ہوگئی تھی، ...... عمر کا بھی تقاضا تھا، کچھ عوارض کے بھی شکار ہوگئے تھے، ...... مگر والد ماجد کے دل میں ہمیشہ ان کی قدر رہی، مولانا بھی والد صاحب کی محبت کے آخر تک اسیر رہے اور جہاں بھی ملاقات ہوتی، یا تذکرہ ہوتا ان کا والہانہ پن محسوس ہوتا تھا، آخری بار جامعہ ربانی کے قیام کے بہت بعد آئے، ساتھ میں ان کے مخدوم دوست جناب قاری شبیر احمد صاحب مدظلہٗ ناظم مدرسہ اسلامیہ شکر پور بھروارہ ضلع دربھنگہ اور ماسٹر وصی احمد صاحب صدیقی دربھنگہ اور مولانا کے صاحبزادہ مولانا راشد صاحب بھی تھے، مولانا دربھنگہ آئے ہوئے تھے، میری دعوت پر یہاں تشریف لائے، اس بار ان کا رنگ ہی کچھ اور تھا، وہی تنہائی و گوشہ نشینی جو مجھے روز اول نظر آئی تھی...... مدرسہ میں ان کے استقبال میں ایک جلسہ رکھا گیا جس میں طلبہ واساتذہ کے علاوہ عام لوگ بھی شریک ہوئے، عشاء کے بعد ایک گھنٹہ تنہا تقریر فرمائی، نہ کسی تعارفی گفتگو کی گنجائش چھوڑی اور نہ کسی دوسرے کو تقریر کی اجازت دی، ہم لوگ قاری صاحب سے بھی سننا چاہتے تھے، وہ پہلی بار آئے تھے، لیکن مولانا نے کسی کو اجازت نہ دی، مولانا ہی کی دعا پر اجلاس اختتام پذیر ہوا،

دوران قیام کئی اہل محبت نے اپنے یہاں لیجانے کی کوشش کی، لیکن کہیں جانے کو آمادہ نہ ہوئے، دن رات مدرسہ ہی میں قیام رہا، صرف کھانے کے وقت میرے گھر تشریف لے جاتے اور والد ماجد کے ہمراہ کھانا تناول فرماتے، یہ ۱۷/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۹ھ مطابق ۲۴/ مئی ۲۰۰۸ء کی بات ہے، اس وقت تک وہ اپنے شیخ طریق حضرت مولانا عبدالواحد صاحب دامت برکاتہم سے اجازت یافتہ ہوچکے تھے، لیکن والد صاحب کے ساتھ وہی تواضع ومسکنت جو کبھی ان آنکھوں نے پہلے پہل دیکھی تھی،

؎ نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں سے عقیدت ہو تو دیکھ ان کو
ید بیضا لئے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں
تمنا درد دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی

نہیں ملتی یہ دولت بادشاہوں کے خزینوں میں

مدرسہ کے معائنہ رجسٹر پر ان دونوں بزرگوں کی روشن تحریریں آج بھی ثبت ہیں، جو آئندہ بھی ہمیں روشنی دیتی رہیں گی انشاءاللہ:

قاری شبیر صاحب مدظلہ نے حوصلہ افزائی کے کلمات لکھے، ایک سطر آپ بھی پڑھئے:

‘‘پچھلے چند برسوں میں اس مدرسہ نے تعلیمی وانتظامی لحاظ سے ترقی کی جو منزلیں طے کی ہیں، وہ لائق ستائش اور قابل تعریف ہے، توقع ہے کہ مستقبل میں علم کا یہ جوئے رواں بحر ذخار بن کر گلشن اسلام کی شادابی وسیرابی کا زبردست ذریعہ بن سکے گا،’’

اس پر مولانا اعجاز احمد اعظمی نے اپنی ان دعاؤں کے ساتھ دستخط ثبت فرمائے:

‘‘اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس ادارہ کو دین اور دینی تعلیم وتربیت کا مرکز بنائیں، اس پورے علاقہ میں اس کی وجہ سے علم وعرفان کی روشنی پھیلے اور کردار وعمل کی پختگی عام ہو، اخلاص وللٰہیت کا سرمایہ حاصل ہو اور طریقۂ شریعت وسنت پر علم وعمل کا کارواں رواں دواں رہے، اور اللہ تعالیٰ اسے حسن قبول سے نوازیں، آمین یارب العالمین بمرتبۃ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ وصحبہٖ اجمعین

ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد’’ (اعجاز احمد اعظمی)

کرنے کے کام

(نوٹ) تحریر تمام ہوئی گفتگو ابھی ناتمام ہے- یہ مضمون میں نے حضرت الاستاذؒ کی وفات کے متصلاً بعد حضرت کے معتمد خاص جناب مولانا ضیاء الحق خیرآبادی صاحب عرف حاجی بابو کی خواہش پر برجستہ لکھ دیا تھا، ان کو اپنے رسالہ کے لئے جلدی تھی، لیکن میری تمنا ہے کہ حضرت مولاناؒ کے علمی کمالات وامتیازات پر بھی قلم اٹھاؤں، حضرت مولانا کا اصل میدان یہی تھا، سردست اس مضمون میں ان کی رجال ساز شخصیت پر روشنی ڈال گئی ہے، لیکن ضرورت ہے کہ مولانا علم وکمال کی دنیا میں جو انفرادیت رکھتے تھے، اور اپنی قوت مطالعہ، ذہن اخاذ اور مجتہدانہ طبیعت کی بدولت جو علمی تبحر وتعمق انہیں حاصل تھا، جس کی مثال بڑی سے بڑی درسگاہوں میں بھی ملنا مشکل ہے-- اسی کے ساتھ ان کی مظلومیت اور صبر وشکر کی بے پناہ قوت جس نے ہر موڑ پر ان کو حوصلہ دیا، اور افراد زمانہ کی ہزار

ناقدر شناشیوں اور ہمت شکنیوں کے باوجود اس مرد آہن کی فولادی شخصیت میں تزلزل آنے نہیں دیا۔۔۔۔ ان دونوں پہلوؤں پر بطور خاص کام کرنے کی ضرورت ہے، مجھے افسوس ہے کہ ملک میں مولانا کے قدر دانوں کی کمی نہیں ہے لیکن اب تک مولانا کی شخصیت پر ایک بھی سیمینار نہیں ہوسکا، اور نہ کوئی جامع مجلّہ شائع ہوا، مجھے اعتراف ہے کہ مولانا کے صاحبزادگان نے ,,سراپا اعجاز'' کے نام سے جو ضخیم مجلّہ شائع کیا ہے، وہ ایک اچھی پیش رفت ہے، اور ماشاء اللہ کافی معلوماتی اور قابل قدر ہے اور کئی اہم منصوبے بھی ان حضرات کے زیر غور ہیں، مگر اس میں علمی ذخیرہ قابل لحاظ حد تک کم ہے، اللہ کرے کہ کچھ اور چیزیں بھی ان کے ذریعہ سامنے آسکیں، اللہ پاک مولانا کی مغفرت فرمائیں اور اعلیٰ علیین میں جگہ مرحمت فرمائیں۔

اختر امام عادل قاسمی

خادم جامعہ ربانی منورواشریف، سمستی پور بہار

۷/ ربیع الاول ۱۴۳۵ھ م ۸/ جنوری ۲۰۱۴ء

فہرست مضامین

سلسلہ نمبر	مضامین	صفحات
۱	تفصیلات	۲
۲	لافانی زندگی	۳
۳	زندہ جاوید	۴
۴	مولانا کا اصل امتیاز	۵
۵	پھونک کر اپنے آشیانہ کو	۵
۶	میرے تعلق کی ابتدا	۷
۷	مدرسہ وصیۃ العلوم- کچھ یادیں	۸
۸	مدرسہ وصیۃ العلوم کی شان	۹
۹	دیوبندی بریلوی کشمکش	۹
۱۰	میرے گھر کا خانقاہی مزاج	۱۰
۱۱	مشرب صوفیاء	۱۱
۱۲	ایک چرواہے کا قصہ	۱۱
۱۳	معصوم بچپن کی دعا	۱۳
۱۴	قافلہ سوئے دیوبند	۱۳
۱۵	لکڑی کی کھڑاؤں	۱۳
۱۶	کہکشاؤں کی ایک انجمن	۱۴
۱۷	اساتذہ کی محبت وعقیدت	۱۴
۱۸	میں نے جو خانقاہ دیکھی تھی	۱۵

سلسلہ نمبر	مضامین	صفحات
۱۹	خانقاہ وصی اللہی کا مسند نشیں	۱۵
۲۰	ایک شیخ نقشبند	۱۶
۲۱	مولانا خانقاہ وصی اللہی میں	۱۷
۲۲	میرے والد ماجد کی الہ آباد آمد	۱۸
۲۳	منورواتشریف آوری اور والد صاحب سے مکاتبت	۱۹
۲۴	غازی پور ہمارے قافلہ کی آمد	۲۲
۲۵	شوکت منزل- جہاں میری کتنی یادیں آسودہ خواب ہیں	۲۳
۲۶	گنگا کا تاریخی ساحل	۲۳
۲۷	غازی پور کی تاریخی اہمیت	۲۵
۲۸	غازی پور کا یادگار سرمایہ- مدرسہ دینیہ	۲۷
۲۹	ایک یادگار رات	۲۸
۳۰	مدرسہ دینیہ کا خوبصورت تعلیمی ماحول	۲۹
۳۱	مدرسہ دینیہ کے اساتذہ باکمال	۳۰
۳۲	مولانا اعجاز احمد اعظمی کی مردم ساز شخصیت	۳۰
۳۳	استاذ کامل کی صفات	۳۲
۳۴	مدرسہ دینیہ میری نگاہ میں	۳۴
۳۵	مولانا کی زندگی کا عہد زریں	۳۵
۳۶	مولانا کا طریقہ تعلیم وتربیت	۳۵
۳۷	میرے قطبی پڑھنے کا قصہ	۳۶

سلسلہ نمبر	مضامین	صفحات
۳۸	علوم قاسمی کی طرف توجہ	۳۷
۳۹	میرا شوق مطالعہ	۳۹
۴۰	میری قلمی زندگی کا آغاز	۴۰
۴۱	مولانا کی وسیع النظری	۴۱
۴۲	بہار پھر اپنی پہلی تاریخ کی طرف واپس آئے	۴۲
۴۳	علمی اختلاف واتفاق	۴۴
۴۴	پیر طریق کی موجودگی میں دوسرے پیر کی طرف رجوع	۴۵
۴۵	قبول حق میں فرخ دل	۴۸
۴۶	مولانا سے میری مراسلت	۴۹
۴۷	قصہ میری پہلی تالیف کا	۵۲
۴۸	ذوق مناظرہ	۵۶
۴۹	میری طالب علمی کے مناظرہ کا ایک قصہ	۵۷
۵۰	آج میں نے خواب کی تعبیر دیکھ لی	۵۸
۵۱	منوروا شریف آخری آمد	۵۹
۵۲	کرنے کے کام	۶۰
۵۳	فہرست مضامین	۶۲